عابد سہیل

سب سے چھوٹا غم

A Decade of Excellence
2004-2013

سب سے چھوٹا غم

عابد سہیل

سب سے چھوٹا غم

(افسانے)

عابد سہیل

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

U
853
A115C

Sabse Chhota Gham

by: Abid Suhail

IIIrd Edition : 2013

Rs.: 200/-

© عابد سہیل

نام کتاب : سب سے چھوٹا غم
مصنف : عابد سہیل
مطبع : کلاسک آرٹ پریس، دہلی
پہلی اشاعت : ۲۰۱۱ء
دوسری اشاعت : ۱۹۷۵ء
سرورق : اظہار احمد ندیم
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

اس کتاب کا کوئی حصہ مصنف/عرشیہ پبلی کیشنز سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کمرشیل استعمال خصوصاً آڈیو، ویڈیو، انٹرنیٹ وغیرہ کے لیے نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتِ حال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: (0) 9899706640, 9971775969 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

Composed at: Frontech Graphics, 9818303136

تیسری اشاعت کا انتساب

قاری کے نام
کہ تخلیق کا
سب سے بڑا پارکھ
وہی ہوتا ہے ۔

دوسری اشاعت کا انتساب

اپنی پیاری چھوٹی بہن

نجمہ مرحومہ

کے

نام

تجھے کیا خبر کہ ہوائے دشت کے سَیل نے
مجھے کتنے زخم عطا کیے مجھے کیا دیا

پہلی اشاعت کا انتساب

ماہنامہ

“کتاب”

کے

نام

تری رہگذر میں چراغ میرے نیاز کا
جو بھڑک اُٹھا بھی تو چھپ کے اوٹ میں کنج کی
تجھے کیا خبر کہ ہوائے دشت کے سَیل نے
اسے کتنے زخم عطا کیے، اسے کیا دیا

فہرست

- یہ افسانے ڈاکٹر محمد حسن 11
- سب سے چھوٹا غم 15
- منیر کی اماں 22
- نوحہ گر 29
- پیاسے 41
- اندھیرے کا کرب 51
- روح سے لپٹی ہوئی آگ 57
- میں اور میں 63
- مدد کا خواستگار 71
- دوسرا آدمی 79
- وہ ایک لمحہ 85
- چھوٹے لوگ 99
- میرے بعد 107
- بفاتن 113
- سچے جھوٹے موتی 119
- نیا سفر 127
- دو نقش ایک تصویر 135

یہ افسانے

قلم ہزار پردے حائل کرتا ہے۔ وہی لفظ بے تکلف صحبتوں میں ادا کیجیے، کیسا سبک، شیریں، بے تکلف معلوم ہوتا ہے۔ وہی قلم سے لکھیے، کیسا بے روح اور مصنوعی لگتا ہے۔ روایت ہاتھ تھامے لیتی ہے، صرف ونحو کا دروبست قلم پکڑے لیتا ہے۔ غرض تحریر ایک قسم کا تکلف، لفظ ایک تصنع اور بات بوجھ معلوم ہونے لگتی ہے۔ نازک ہونٹوں سے نکلی ہوئی سادہ اور سہج آوازیں جو پھولوں کی خوشبو کی طرح نازک اور آزاد، بے تکلف اور ہر قسم کی ادعائیت کے بوجھ سے مبرا ہوں تحریر کو میسر نہیں آتیں، جیسے تحریر کا رشتہ تحریر سے ہو اور اس زندہ اور متحرک لفظ سے نہ ہو، جو گفتگو میں تازگی اور سادگی رکھتا ہے اور تحریر میں آتے ہی بوجھل ہو جاتا ہے۔ اصل میں تحریر کی شاید سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ گفتگو کی طرح بوجھل پن سے آزاد ہو جائے۔ اسی لیے سہل ممتنع کی سادگی کو فن کی معراج کہا گیا۔ اسی لیے کسی مرد عارف نے یہ بات کہی۔

ایں قدر دانم کہ دشوار است آساں زیستن

عابد سہیل کو ایک مدت سے پڑھتا رہتا تھا، اس لیے کبھی ان کے افسانے نہ پڑھے، جب شخص سامنے ہو تو عکس کون دیکھے۔ پھر اچانک ایک روز ''سب سے چھوٹا غم'' پڑھا۔ وہ بھی اس طرح کہ مصنف کے نام پر نظر بعد میں پڑی، پہلے افسانہ پڑھا گیا۔ ایسا لگا جیسے جس سہج پن کی مجھے تلاش تھی وہ مل گیا۔ پھر ان کے دوسرے افسانے پڑھے۔ اکثر کوشش اور آورد سے خالی تھے۔ اسی لیے تقلید سے آزاد تھے۔ یہ منٹو، بیدی، عصمت یا کرشن کی آواز بازگشت نہ تھے۔ انھیں تو لکھا ہی نہیں گیا، دریافت کر لیا گیا تھا۔ لکھا لکھایا بالکل جوں کا توں۔ یہ کام کتنا

مشکل ہے۔ کھردرے اور سخت پتھروں کے اندر خوابیدہ صنم کو تراش کر نکال لینے کا ہنر جوئے شیر لانے سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔ جی چاہا کہ کھلی ہوا اور فطری فضا کی اس دنیا میں آزادی کے ساتھ تھوڑی دیر سانس لیا جائے۔

مجھے یہ افسانے عزیز ہیں۔ اس لیے کہ ان میں زندگی کا دھیما پن ہے۔ نرمی اور شائستگی ہے، زندگی اپنی ساری پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر چھوٹی سی گرہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بڑی معصوم سی گرہ، نرم و نازک ریشم کی سی گرہ۔ جو کھلتی مشکل سے ہے، مگر اپنی نرمی نہیں کھوتی۔ سر پر مہربان سورج چمک رہا ہے، پاؤں کے نیچے سبزے کے بیچ سے بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں بچھی ہوئی ہیں اور زندگی کے کھوئے ہوئے رشتوں اور دھندلائی ہوئی مسرتوں کی تلاش جاری ہے۔

رشتوں کی اسی نرمی سے آج کی مصروف اور مشینی زندگی جتنی عاری ہو چکی ہے، اتنی ہی ان کے تذکرے سے آسودگی ملتی ہے۔ کہاں ہیں شوکت بیگم جو ازدواجی زندگی کی ساری ناہمواریوں کو اس قدر تحمل اور تجمل سے جھیل سکیں۔ کہاں ہیں وہ منیر کی اماں جو محبت اور خلوص کے پاکیزہ رشتوں کو آخری سانس تک نبھا سکیں۔ کہاں ہیں ایسے چچا جو اس قدر قریب سے بھتیجی کی نفسیات میں گھلتے ہوئے زہر پر توجہ کر سکیں؟ رشتوں کی یہ نزاکت اور تہہ داری عابد سہیل کے افسانوں کی دوسری خصوصیت ہے۔ شاید اس میں لکھنؤ کی زندگی کی آہستہ روی کو بھی دخل ہے اور روایات کی امارت کو بھی لیکن سب سے بڑی اس گہرے مشاہدے کی جسے ژرف بینی کا نام دیا جاتا ہے۔ ہر مکالمہ، ہر قدم، ہر واقعہ اسی ژرف بینی کی مدد سے بڑی احتیاط اور بے ساختگی سے ان افسانوں میں جگہ پاتا ہے۔ اسی لیے اس سادگی اور سبج بن کے پیچھے بڑی فنکاری ہے جو کہیں سامنے نہیں آتی۔ زیریں لہر کی طرح نیچے ہی نیچے رہتی ہے۔

ان افسانوں کی ایک اور ادا بھی مجھے پسند آئی۔ وہ ہے ان کی تہذیبی فضا۔ یہاں تازگی کا احساس ہوتا ہے گو اب یہ تہذیب پرانی ہو چکی اور جلد ہی تاریخ کے اوراقِ پارینہ کے علاوہ اس کے جلوے دیکھنے کو بھی نہ ملیں گے مگر ڈھلتی ہوئی دھوپ کی یہ کیفیت عجیب دلکشی رکھتی

ہے۔ ان کہانیوں کی تہذیب آراستگی میں نہیں، کردار کی نرمی اور شائستگی میں جھلکتی ہے۔ بی بفاتن اس کی کیسی دلکش تصویر ہے، جو اپنے تہذیبی سیاق و سباق میں بولتی نظر آتی ہے۔

ان افسانوں میں سب سے زیادہ دل کشی شاید ”اندھیرے کا کرب“ اور ”بی بفاتن میں“ ہے یا پھر ”میں اور میں“ اور ”سچے جھوٹے موتی“ میں جن کی تازگی اور سادگی او ہنری کی کہانیوں کی بے ساختہ یاد دلاتی ہے یا پھر ”نوحہ گر“ میں ہے جو بلیغ خاموشیوں کے تانے بانے سے بنی ہوئی کہانی ہے اور یہی کیوں اس مجموعے کی بیشتر کہانیوں کا انمول جوہر یہی بلیغ خاموشیاں ہی تو ہیں۔ ”نوحہ گر“ اور ”سب سے چھوٹا غم“ دونوں میں لوگوں اور ان کے چھوٹے بڑے دکھ درد سے بھری ہوئی اس دنیا میں فرد اپنی چھوٹی سی انفرادیت کے لیے ذرا سی جگہ ڈھونڈھتا نظر آتا ہے۔ مگر وہ کہاں جائے اور کیا کرے۔ ہر ستون سے تو مراد کی ڈوریاں بندھی ہیں، ہر تاریخی عمارت کے چپے چپے پر اس سے پہلے آنے والوں نے اپنے نام اور پیغام کندہ کر ڈالے ہیں۔ وہ اپنی اس چھوٹی سی ہستی کا بوجھ کہاں لا ڈالے، اس انبوہ میں اپنا چہرہ کیوں کر پہچانے، اپنے دکھ اور مسرت کو کس آئینے میں دیکھے۔ کس پیمانے سے ناپے۔ عابد سہیل کی کہانیوں کی انفرادیت انبوہ اور فرد، اجتماعی اور انفرادی زندگیوں کے اسی لطیف رشتے میں مضمر ہے جو ”اندھیرے کا کرب“ کی آوازوں کی طرح اندھیرے میں ہر سمت سے ابھرتی ہیں لیکن روشنی ہوتے ہی بھیانک سناٹے میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اپنی ہستی کی اس تلاش میں عابد سہیل کو کس حد تک کامیابی ملی ہے اس کا فیصلہ تو پڑھنے والے ہی کریں گے کہ ان افسانوں کا سارا در و بست کارگہہ شیشہ گری کا سا ہے کہ یہاں سانس بھی آہستہ لینا ضروری ہے اور اس بارے میں بقول شاعر۔

”جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود“

عابد سہیل کو قصہ گوئی کا فن آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں دلچسپی آخر جملے تک قائم رہتی ہے۔ افسانے کے در و بست میں وہ آغاز کی ڈرامائیت پر زور نہیں دیتے۔ افسانہ اس بے تکلفی سے شروع ہو جاتا ہے کہ ڈرامائیت کی سنسنی خیزی سے اس کا کوئی تعلق قائم نہیں کیا جا

سکتا۔ پھر بھی ہے یہ ڈرامائیت کہ پڑھنے والا اپنے کو اچانک ایک ایسے شگفتہ اور شاداب ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے جہاں اسے ہر آنے والے جملے کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ کوئی بہت بڑا واقعہ ہونے والا نہیں ہے لیکن ان چھوٹے چھوٹے جملوں سے، چھوٹے معمولی اور حقیر سے واقعات سے کہانی کچھ اس طرح بنتی چلی جاتی ہے کہ اگلے موڑ کا اشتیاق بڑھتا ہی جاتا ہے پھر وہ موڑ آ بھی جاتا ہے اور ذہن کے سامنے کیفیات اور مضمرات کا ایسا سلسلہ چھوڑ جاتا ہے جو کچھ دیر تک ہمارے ذہن کو اپنے طور پر اس افسانے کا تتمہ فراہم کرنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ آخر شوکت بیگم نے ایسا کیوں کیا؟ آخر اندھیرے کے کرب کی آوازیں کس کی تھیں؟ آخر نوحہ گر کا اجنبی کون تھا اور اس کا پہلے دو کرداروں سے کیا رشتہ تھا؟ آخر ان سب کے مضمرات اور متعلقات کیا ہیں؟ ان کے فکری رشتے اور تہذیبی سیاق کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں؟ ان افسانوں کی کامرانی یہی ہے کہ یہ فکر و احساس کے اندھیرے میں روشنی کی ایک ہلکی سی کرن چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔

— محمد حسن

۱۳؍ نومبر سنہ ۱۹۷۶ء

سب سے چھوٹا غم

اس نے تینوں طرف کی جالیوں میں بندھے ہوئے ہزاروں بلکہ لاکھوں دھاگوں کو دیکھا اور ان میں دس سوا دس سال قبل اپنے باندھے ہوئے دھاگے کو تلاش کرنے لگی۔

بائیں طرف والی جالی پر جس کے باہر گیندے کے پیلے پیلے پھول اور ہار ڈھیر تھے، اور بہت سے دیے جل رہے تھے اس نے اپنے دھاگے کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اسے خوب اچھی طرح یاد تھا کہ اس طرف جالی کے بالکل کونے میں اس نے دھاگے میں ایک گرہ لگائی تھی اور پھر دوسری گرہ جاوید نے۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ ابھی اس کی انگلیاں پوری طرح گرہ لگا بھی نہ پائی تھیں کہ جاوید کی انگلیاں وہاں پہنچ گئی تھیں اور انگلیوں کے اس لمس کے بعد جاوید اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرانے لگا تھا اور وہ شرما کر نیچے دیکھنے لگی تھی۔

لیکن ان کا باندھا ہوا دھاگا کون سا تھا؟ اسی لمحہ اسے خیال آیا کہ اس وقت اس جگہ شاید بہت زیادہ بھیڑ تھی اور جاوید نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تھا اور وہ سامنے والی جالی پر چلی گئی تھی۔ یہ سوچ کر اس نے درمیان والی جالی کا رخ کیا لیکن قدم آگے بڑھانے سے قبل اس نے ایک بار پھر اس جالی پر نظر ڈالی۔ جیسے وہ اپنا باندھا ہوا دھاگا پہچان ہی تو لے گی۔

دوسری جالی پر پہنچتے پہنچتے اسے ایسا لگا جیسے پہلی جالی پر جا کر اس نے غلطی کی تھی اور اسے اس کی یاد داشت نے دھوکہ دیا تھا۔ دھاگا تو اس نے یہیں باندھا تھا، بالکل کونے میں۔ لیکن یہاں بھی لاکھوں دھاگے بندھے تھے، کسی میں ایک گرہ تھی، کسی میں دو، ان میں اس کا اپنا کون سا تھا؟ اس نے کونے کے دھاگوں پر ہاتھ پھیرا، آہستہ آہستہ، جیسے جاوید کے

ہاتھوں کے لمس سے وہ اپنے دھاگے کو پہچان ہی تو لے گی۔ لیکن کہیں خواہشوں کی گرمی تھی، کہیں آرزوؤں کی نرمی اور کہیں مایوسیوں کی تاریکی اور مصائب کی سختی۔

اس نے دوسری بار اسی کونے کے دھاگوں پر ہاتھ پھیرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک دبلی پتلی، گوری چٹی لمبی سی عورت وہاں آ گئی۔ وہ کچھ دیر تو خاموش کھڑی جالی کو ایک ٹک دیکھتی رہی۔ پھر اس نے دائیں طرف کی جالی میں لال دھاگا باندھا، مڑ کر عقیدت سے مزار کی طرف دیکھا اور آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ عورت جوں ہی باہر نکلی، اس نے اس کے باندھے ہوئے دھاگے پر انگلی رکھ دی۔ اکتوبر کی ان ابتدائی تاریخوں میں جب دھوپ چھاؤں کے موسم کے باوجود مزار کے باہر وسیع و عریض آنگن کا ایک ایک پتھر تپ رہا تھا ایک سرد لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ دھاگا سمٹا، پھر پھیلا اور دو آنکھیں بن گیا، رحم کی بھیک مانگتی ہوئی آنکھیں، دو لب بن گیا، خواہشوں کی گویائی عطا کرتے ہوئے لب۔ ''اے شیخ تو نے بادشاہوں کی جھولیاں مرادوں سے بھر دی ہیں، میری جھولی میں بھی ایک گلاب ڈال دے۔''

وہ اسی جگہ کھڑے کھڑے کانپ گئی، جیسے نیند سے اچانک کوئی کسی کو جگا دے یا کوئی بے حد بھیانک خواب سے جاگ پڑے۔ اس نے اپنے دونوں طرف مسہری پر سوتے ہوئے دونوں بچوں کو ٹٹولنے کے لیے ہاتھ بڑھائے، لیکن اس کا بایاں ہاتھ محراب سے اور دایاں نہایت خوبصورت کپڑوں سے ملبوس ایک عورت سے ٹکرا گیا۔ کمر میں سونے کی کردھنی، کانوں میں سونے کے بندے، جن میں ہیرے چمک رہے تھے۔ گویا خواب سے جاگنے کے بعد حقیقت سے اس کا پہلا ٹکراؤ تھا۔ کھلتا ہوا گندمی بلکہ شاید گورا رنگ جس کو خوشحالی، خوشیوں بھری زندگی نے اور بھی حسین بنا دیا تھا، بلکہ چمکا دیا تھا۔

اس عورت کو بھی بھلا کوئی غم ہو سکتا ہے؟ اس نے بالائی کی رنگت والے ملائم اور گداز ہاتھوں کو دیکھا۔ نظریں جھکا کر دونوں چھوٹے چھوٹے پیروں کو دیکھا۔ ایسے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پیر جیسے انھیں بچپن میں لوہے کے جوتے پہنا کر رکھا گیا ہو، پھر سر اٹھا کر

کنکھیوں سے ان بڑی بڑی آنکھوں کی طرف دیکھا جو تھوڑی دیر قبل اس کو ایسی لگی تھیں جیسے کسی نے گلاب کے کٹورے بھر دیے ہوں۔

لیکن اب یہ گلاب کے کٹورے چھلکنے ہی کو تھے اور آنسوؤں کے دو قطرے دونوں کٹوروں کے کونوں سے ٹپک پڑنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

اس عورت کو بھلا کیا غم ہو سکتا ہے؟ اس نے سوچا۔ غربت اور مفلسی تو اس نے دیکھی ہی نہیں، اولادیں یقیناً ہیں ورنہ اس قدر خوش بھلا رہ سکتی تھی، مانگ کا سیندور اور چوڑیاں اور بندے۔ چھی چھی کیسا برا خیال آیا تھا، اس کے دل میں۔ خدا اسے سدا سہاگن رکھے اور اس کے پتی کی عمر دراز کرے۔ لیکن کوئی زخم تو ضرور تھا، جسے نہ دولت، نہ شوہر، نہ آل، نہ اولاد، نہ خوبصورت کپڑے، نہ قیمتی زیور، غرض کوئی نہ بھر پایا تھا اور وہ یہاں چلی آئی تھی۔

اس نے ساڑی جس طرح باندھ رکھی تھی اسی طرح سے ساڑی باندھنا جاوید کو بھی پسند تھا، لیکن وہ ساڑی اس انداز سے باندھ ہی نہ پاتی تھی، اسے اس بات سے ایک اور بات یاد آ گئی اور اس کی اداس اور غمگین آنکھوں میں بھی ہنسی کی ایک چمک پیدا ہو گئی۔

جاوید نے جب تاج محل میں ایک خوبصورت لڑکی کو بار بار پلٹ کر دیکھا تھا، تو وہ اداس ہو گئی تھی، شادی کو ابھی چند ہی دن تو ہوئے تھے اور خلوتوں میں پیار و محبت لٹانے والا جاوید جلوت میں اور وہ بھی اس کی موجودگی میں اس طرح ہرجائی ہوا جا رہا تھا۔ ویسے اس نے خود کو سمجھایا بھی تھا کہ ہر پرکشش اور خوبصورت چیز کی طرف نظریں خود بخود اٹھ جاتی ہیں لیکن بار بار مڑ مڑ کر دیکھنا بلا ارادہ تو نہیں ہو سکتا۔ اس نے کئی بار پلٹ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا اور تاج محل کی پشت پر، جمنا کے کنارے، جب وہ عورت مسجد کی طرف کھڑی تھی تو دریا کے اس پار قلعہ کی طرف دیکھتے ہوئے بھی اس نے نظریں چرا کر اس عورت کی طرف دیکھ لیا تھا۔

لیکن جاوید کی گفتگو کے انداز، برتاؤ، مسکراہٹ، ہنسی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد تاج کے حسن کے کسی پہلو کی طرف اس کی توجہ دلاتے ہوئے اس کے ہاتھ کو دھیرے سے چھو دینے کی اس کی عادت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ پھر یہ بات تو اسے ایک دن خود بخود سمجھ میں آ گئی

تھی کہ اس دن جاوید اس عورت کو نہیں بلکہ اسی ساڑی کو دیکھ رہا تھا جو وہ عورت ایک خاص طریقہ سے باندھے ہوئے تھی۔

کہیں اس عورت کو ایسا ہی کوئی وہم، کوئی بے نام غم تو نہیں؟ بے نام غموں کے تو ہم عورتوں کے پاس خزانے ہوتے ہیں جنھیں ہم لٹاتے نہیں بٹور بٹور کر رکھتے ہیں۔ خوشیوں کے لمحوں کو بوجھل بنانے کے لیے بے محابہ، بے ساختہ قہقہوں کو شائستہ بنانے کے لیے، انتہاؤں کو زندگی کے آداب سکھانے کے لئے۔ لیکن ایسے بے نام غموں کے لیے کوئی اتنی دور تو نہیں چلا آتا۔

وہ عورت جالی پر دھاگا باندھنے لگی تو اس نے کنکھیوں سے اس کے چہرے کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ اداسی کا ایک پردہ تو ضرور تھا۔ آنکھیں اب بھی بھیگی ہوئی تھیں لیکن چہرے کا میک اپ اسی طرح قائم تھا جیسے بیوٹی سیلون سے نکل کر سیدھے یہیں چلی آئی ہو۔ گرد و غبار کا ایک بھی نشان نہ تھا، ساڑی پر ایک بھی شکن نہ تھی۔ اس عورت نے دھاگے میں گرہ لگائی تو اس کی نظریں قدرتی رنگ میں رنگے ہوئے اس کے لمبے لمبے ناخنوں پر پڑیں جن کا یہ حسن، یہ چمک دیکھ ریکھ اور گھرداری کے کاموں سے بے نیازی کے بغیر ممکن نہ تھی۔

دھاگے میں گرہ لگانے کے بعد اس نے ذرا سا جھک کر، دونوں ہاتھ باندھ کر، جیسے جالی ہی کو پرنام کیا، پھر مڑی اور مزار کے قریب جا کر کھڑے ہی کھڑے تقریباً دہری ہوگئی اور ایسے پھوٹ پھوٹ کر ایسے روئی کہ سارے بندھ ٹوٹ گئے، بلکہ بہہ گئے۔ لیکن ان آنسوؤں نے اسے اور بھی خوبصورت، اور بھی معصوم بنا دیا تھا۔ جب وہ باہر نکلی تو وہ خود بھی تجسّس کے مارے مزار کے سرہانے تک آ گئی۔ اس نے پرس کھولا، دو بڑے بڑے نوٹ نکالے، پھر اور نوٹ نکالے اور درگاہ کے چندے کے بکس میں ڈال دیے اور الائچی دانے لینے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ اسی طرح پھیلائے پھیلائے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اپنا سر ہاتھوں پر ٹکا دیا۔ پھر دھیرے دھیرے سر اٹھایا، الائچی دانے پہلے ساڑی کے پلّو میں قبول کیے پرس میں احتیاط سے رکھ لیے اور چلی گئی۔ چند قدم بعد اس نے پلٹ کر مزار کی طرف ایک بار پھر

دیکھا اور سر جھکائے بلند دروازہ کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔

اب وہ اسی جالی کے پاس آ گئی جہاں تھوڑی دیر قبل اس عورت نے دھاگا باندھا تھا لیکن رنگ برنگے دھاگوں کے جنگل میں وہ اس کا دھاگا پہچان نہ سکی۔ اس کے غم کے راز تک نہ پہنچ سکی۔

اسی درمیان سیاحوں کا ایک ریلا درگاہ میں داخل ہوا تو گائڈ نے رٹے رٹائے جملے دہرائے۔ شیخ سلیم چشتی کی دعا سے اکبر کو جہانگیر نصیب ہوا۔ یہاں لوگ آتے ہیں اور دامن مراد بھر لے جاتے ہیں۔

مزار کے باہر کی جالی پر ایک سیاح نے ہاتھ رکھا تو گائڈ نے نہایت آہستگی سے وہ ہاتھ ہٹا دیا اور کہا: ''اس مزار کی جالی دنیا کے سارے مزاروں کی جالیوں سے خوبصورت ہے، کچھوے کی ہڈی پر سیپ کے کام کی یہ دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے دیا سلائی جلائی تو مزار کی بیرونی دیوار کا وہ حصہ جس پر روشنی پڑ رہی تھی، چمک اٹھا، جھلمل کرنے لگا۔

سیاحوں کا ریلا چلا گیا تو وہ دوبارہ تقریباً تنہا رہ گئی۔ ایک بار پھر اس نے مزار کے قدموں کے سامنے کی جالی پر بندھے ہوئے دھاگوں پر ہاتھ پھیرا تو جاوید دروازہ کھول کر کمرہ کے اندر داخل ہو گیا، نشہ میں دھت، ٹائی کی گرہ ڈھیلی، بال بکھرے ہوئے، سوٹ شکن آلود، آنکھیں سرخ اور دہاڑتا ہوا: ''میں کہتا ہوں یہ میرا گھر ہے یا کسی اور کا۔ دو دو گھنٹہ چلاؤ تب کہیں جا کر دروازہ کھلتا ہے۔ نہ آیا کروں، کہیں اور سو رہا کروں؟''

''ذرا آنکھ لگ گئی تھی، تھوڑی دیر پہلے تک تو جاگ رہی تھی۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور ٹائی کی گرہ کھولنے لگی۔

''ہونہہ جاگ رہی تھیں تھوڑی دیر پہلے تک۔ تو پھر مر کیوں گئی تھیں میرے آنے پر۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور کوٹ نرم نرم ہاتھوں سے اتار دیا اور ہاتھ کا سہارا دے کر اسے بستر پر لٹا دیا، پھر جوتوں کی ڈوری کھولی، جوتے اتارے، موزے اتارے اور بستر پر اس کی ٹانگیں پھیلا دیں۔

اب یہ بات ہر رات کا معمول بن گئی تھی۔ ویسے اسے دن میں سب کچھ حاصل ہوتا۔ عزت، دولت، کار، ملازم، اولادیں، لیکن یہ سب کچھ ایک باریک دھاگے سے لٹکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ دھاگا کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا تھا۔ اگر اس کے خدشات صحیح ثابت ہوئے تو وہ کیا کرے گی، تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود دس بارہ برس تک اس طرح کی زندگی گزارنے کے بعد کیا وہ نئے سرے سے بالکل دوسری طرح کی زندگی شروع کر سکے گی۔

سوالیہ نشان پھیلا اور پھیلتا ہی گیا۔ اسی وقت ایک بوڑھی سی عورت نے دوسری عورت کی گود سے ایک بالکل چھوٹا سا بچہ لے کر مزار کے قدموں میں ڈال دیا۔ دونوں عورتوں نے جن کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے، اسی جگہ بیٹھ کر سر کو اتنا جھکایا، اتنا جھکایا کہ سجدے کا گمان ہونے لگا۔ بوڑھی عورت اٹھی اور اس نے جالی کے پاس جا کر ایک دھاگے کی گرہ کھول دی، بچہ کو گود میں اٹھا لیا۔ دونوں نے ایک بار پھر عقیدت سے مزار کی طرف گردنیں جھکائیں اور باہر نکل گئیں۔

اسی لمحہ اس کی نظر ماں کی گود میں مسکراتے ہوئے بچہ پر دوبارہ پڑی اور وہ خود بھی مسکرا دی۔

لیکن اس کی یہ مسکراہٹ عارضی تھی۔ ساری جالیوں پر محرومیوں، تمناؤں، ناکامیوں کے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے لاکھوں لاکھ دھاگوں کے درمیان ایک پھول کب تک اپنی شادابی برقرار رکھ سکتا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ کی مٹھی کھولی تو سرخ دھاگا پسینہ میں بھیگ چکا تھا۔ اب وہ جالی کے کسی ایسے کونے کو تلاش کرنے لگی جہاں اس سے قبل کسی نے دھاگا نہ باندھا ہو، لیکن ایسی کوئی جگہ نہ تھی۔ ہر جگہ ایک دو نہیں درجنوں دھاگے بندھے ہوئے اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے آنسو بہا رہے تھے۔ آنسوؤں کے اس سیلاب میں اس کے ایک قطرہ کی بھلا کیا اہمیت۔ گہرے زخم، غم و اندوہ کے پہاڑ اور مصائب کے طوفان خیز دھارے جن کی یہ دھاگے علامت تھے، اسے اپنے غم کے مقابلے میں بے حد بڑے اور عظیم معلوم ہوئے۔

اس نے ایک بڑا دھاگا لیا اور جالی کے چاروں کونوں پر باندھ دیا، پوری جالی کو گھیر کر، سارے غموں، دکھوں اور تمناؤں کا احاطہ کیے ہوئے۔ اب وہ رو پڑی۔ اس کی آنکھیں سمندر بن گئیں۔ اس نے آنسو پونچھنے کی کوشش کی اور رندھے ہوئے گلے سے بولی ”شیخ ان سب کی مرادیں بر آئیں تو میرا غم بھی ہلکا ہو جائے گا۔ اتنے بہت سے دکھوں کے بیچ میں کیسے خوش رہ سکوں گی۔“

باہر صحن کے پتھر اب بھی اتنے ہی گرم تھے، سورج اب بھی آگ برسا رہا تھا لیکن ان کا احساس کیے بغیر، خاموش، گردن جھکائے وہ اس طرح باہر نکل آئی جیسے اس کے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔

■ ■

منیر کی اماں

منیر کی اماں یوں تو اب نوے پیٹے میں تھیں، لیکن کمر اتنی ہی خمیدہ تھی جتنی بیس سال اُدھر تھی، چہرہ کی جھریوں میں کچھ اضافہ ضرور ہو گیا تھا لیکن ایسا زیادہ فرق بھی نہیں ہوا تھا کہ دس بارہ برس بعد دیکھنے پر بھی پہچاننے میں کوئی وقت ہو، پہلے اکنی ایک فٹ کے فاصلے سے دیکھ لیتی تھیں، اب دس کا سکہ آنکھوں کے بالکل پاس لا کر انگلیوں سے ملتیں، گول دندانوں پر انگلیاں پھیرتیں تب پہچان پاتیں، اپنے میلے چکیلے بڑے سے بٹوے سے جس میں کٹی بلکہ کٹی ہوئی چھالیہ، تمباکو، کتھا ہوا کتھا اور سوکھے چونے کے علاوہ دس بارہ آنے کی ریزگاری بھی ہوتی کوئی سکہ تلاش کرنے لگتیں تو۔۔۔

”رہنے دو منیر کی اماں،“ میری والدہ کہتیں، ”اب کب تک پیسے دیے جاؤ گی۔ اب تو تمہارے لینے کے دن ہیں، ساری زندگی تو دیا۔“

”ہے بہو۔“ منیر کی اماں بہو کی ”و“ کو ذرا کھینچ کر ناک میں کہتیں، ”اتنے دنوں بعد تو للا آیا ہے۔۔۔ جگ جگ جیے، دودھوں نہائے، پوتوں پھلے۔۔۔ لے للا۔“ اور اتنی ہی دیر میں ان کی انگلیاں جو بٹوے میں کتھے کو چونے، چونے کو چھالیہ اور پھر ان سب کو ریزگاری سے الگ کرنے میں مشغول ہوتیں، دس کا سکہ نکال کر میرے ہاتھ میں رکھ دیتیں۔

منیر کی اماں کا کھردرا ہاتھ میرے ہاتھ سے ٹکراتا تو مجھے لگتا جیسے وہ میرے ننگے جسم کو گود میں لیے کھلا رہی ہوں، میرا للا سو جا، نندیا رانی آتی ہے، دودھ کٹورا لاتی ہے، للا کو پلاتی ہے۔ آنکھوں میں نندیا لاتی ہے۔۔۔ گیت کے یہ بول میرے کانوں میں پہنچے ہیں، کبھی آماں کی

آواز میں، کبھی بہنوں کی آواز میں، کبھی کوٹھے والی خالہ کی آواز میں، کبھی سیتلا سہائے کی بڑی بہن کی آواز میں ۔۔۔ لیکن اس وقت جیسے یہ سب کچھ میری اپنی آنکھیں دیکھ رہی ہوں، جیسے یہ لوری میرے اپنے کان سن رہے ہوں، جیسے ان کی کھردری انگلیاں مجھے گود میں لے کر کھلاتے وقت میرے اپنے جسم سے ٹکرا رہی ہوں، محبت، شفقت بھری کھردری لیکن میٹھی انگلیاں ۔

منیر کی اماں نے اس قصباتی شہر میں جہاں میں نے آنکھیں کھولیں، جہاں میں بڑا ہوا، جہاں میں نے پہلی محبت کی، جہاں مجھے پہلی مایوسی ملی، کچھ اس طرح مشہور تھیں کہ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جہاں منیر کی اماں کو جاننے والا کوئی نہ کوئی نہ ہو۔ حد تو یہ ہے کہ ان کا بیٹا منیر بھی، جو کچہری میں چپراسی تھا، منیر کی اماں کے بیٹے کے نام سے ہی جانا جاتا۔ منیر ۔۔۔ کون منیر؟ منیر کی اماں کا بیٹا، لیجیے تعارف مکمل ہو گیا۔

میرے شعور میں اولین یادیں جس گھر کی ہیں، اس کے سارے در و دیوار تو یاد نہیں بس ایک کمرہ یاد ہے، ایک آنگن، ایک باورچی خانہ اور ان سب میں اِدھر اُدھر آتی جاتی، نیلے تنگ مہری کے پیجامہ میں گھر بھر کی چابیوں کا گچھا لٹکائے، تیز تیز چلتی منیر کی اماں۔ جب ذرا اور تیز چلتیں تو چابیوں کا گچھا جھولنے لگتا۔

کچھ اور یادیں اس طرح ہیں۔ دال بگھارتی منیر کی اماں، میرے لیے کرچھے میں گھی۔ گڑ گرم کرتی منیر کی اماں، مجھ پر ڈانٹ پڑتے وقت میرے لیے سینہ سپر ہو جانے والی منیر کی اماں اور میری پٹائی لگنے پر باورچی خانہ سے اپنے لال اور میلے دوپٹہ سے، جسے مَیل نے سارے رنگوں سے جدا ایک نیا رنگ بخش دیا تھا، نکلتے تیز تیز باہر آتی اور آنسو پونچھتی ہوئی منیر کی اماں۔

پندرہ سولہ برس کی جھلمل یادوں نے منیر کی اماں کو کئی بار روٹھتے اور کام چھوڑ کر جاتے ہوئے دیکھا۔ ان کی خفگی کسی نہ کسی طرح میری ذات ہی سے متعلق ہوتی۔ شرارت کرنے پر میری جھوٹ موٹ کی پٹائی بھی لگتی تو منیر کی اماں روٹھ کر گھر بیٹھ رہتیں۔ امتحان کے قریب

رات کے دس دس بجے تک مجھے سونے نہ دیا جاتا تو وہ خفا ہو جائیں، کسی فرمائش کے پورا نہ کیے جانے پر میں ٹھنٹھناتا اور مجھ پر ڈانٹ پڑتی تو منیر کی اماں آنا چھوڑ دیتیں لیکن پھر کچھ ایسا ہوتا کہ وہ لوٹ آتیں۔ گھر میں سب ہی ان کی اداؤں سے واقف تھے اس لیے کوئی ان کو منانے نہ جاتا اور کوئی جاتا بھی تو کیا وہ مان جاتیں۔۔۔ جب دو تین دن گزر جاتے تو وہ روٹھی روٹھی سی آتیں۔ ''بس اب دہلیز پار نہ کروں گی، بہت ہو چکا، کمبخت دل نہ مانا۔'' وہ کہتیں، ''ذرا دیر اپنے للا کو کھلا لوں، بس۔'' اور ان کی آمد کی خبر سن کر میں بے تحاشا دوڑ کر ان کی گود میں پہنچ جاتا اور وہ ادھر ادھر دیکھتیں، اور اپنی قمیص کی بہت سی جیبوں میں سے کسی ایک سے مٹھائی، ریوڑی، مونگ پھلی یا اور کوئی چیز نکال کر مجھے کھلانے لگتیں۔

''ہاں، ہاں، ہم لوگوں سے کوئی محبت تھوڑی ہے، بس اپنے للا کو دیکھنے چلی آئی ہو۔ لے جاؤ، اپنے للا کو، اپنے ساتھ ہی رکھو۔'' میری والدہ کہتیں تو منیر کی اماں سنی ان سنی کر دیتیں اور کچھ ایسی بے تعلق بنی رہتیں جس میں ہزاروں تعلق پنہاں ہوتے ہیں۔

والدہ دیکھتیں کہ تیر نشانہ پر نہیں بیٹھا ہے اور وہ اب بھی خفا ہیں تو اپنا آخری حربہ استعمال کرتیں، خاموشی سے اٹھتیں اور دھلی دھلائی پلیٹ پانی کی ٹنکی کے پاس بیٹھ کر اس طرح دھونے لگتیں کہ منیر کی اماں کی نظر پڑ جائے اور جیسے ہی منیر کی اماں کی نظر پڑتی وہ اٹھ کھڑی ہوتیں۔ ''اے بہو یہ کیا۔۔۔ میں نے کام چھوڑ دیا تو اس کا یہ مطبل کہاں ہوا کہ تم کام کرنے لگو۔'' وہ مطلب کو ہمیشہ مطبل کہتیں اور اپنا جملہ بار بار دہراتی ہوئی ٹنکی کے پاس پہنچ جاتیں۔ پلیٹ دوبارہ دھو کر الماری میں جما دیتیں۔ آنگن پر نظر دوڑاتیں۔ ''ہے ہے کیسا گندا پڑا ہے سارا گھر'' کہہ کر جھاڑو دینا شروع کر دیتیں۔ چلیے منیر کی اماں کی خفگی ختم ہو گئی۔

ہمارے دن بگڑے تو وہ چپراسی جو آگے پیچھے گھومتے تھے، آنکھیں چرانے لگے۔ وہ لوگ جو صبح شام حاضری دینے آتے تھے آپ سے تم پر اتر آئے۔ سب کچھ بدل گیا لیکن نہ بدلیں تو منیر کی اماں۔ والدہ جب تک پلنگ پر نہ بیٹھ جاتیں وہ زمین پر بھی نہ بیٹھتیں، کہیں سے تھکی تھکائی آتیں اور والدہ کچھ کام بھی کر رہی ہوتیں تو بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ جلدی سے

پلنگ پر بیٹھ جاتیں کہ منیر کی اماں اپنی سانس تو درست کرلیں۔ وہ اب بھی پہلے ہی کی طرح لکڑی کے پٹرے پر زمین پر بیٹھتیں، اماں لاکھ کہتیں کہ منیر کی اماں اوپر بیٹھ جاؤ لیکن۔۔۔ ''نہیں بہو،'' منیر کی اماں کہتیں، ''اس گھر کا نمک کھایا ہے، ہمارا رزاق للا کی اترن پہن پہن کر اتنا بڑا ہوا ہے۔''

مجھے ملازمت ملی تو والدہ کو اپنی پہلی تنخواہ سے منی آرڈر بھیجتے وقت میں نے کوپن پر لکھ دیا کہ ان میں سے دو روپے منیر کی اماں کو دے دیجیے۔ یوں تو منیر کی اماں والدہ سے ملنے مہینہ میں دو تین بار پہلے بھی آتی تھیں اور ہمیشہ میرے چھوٹے بھائی اور بہن بھائی کو پانچ پیسہ کا ایک ایک سکہ بھی دے جاتیں لیکن اب ہر ہفتہ آنے لگی تھیں اور ہمیشہ وہی ذکر ''میرا للا نوکر ہو گیا، اپنے ابا سے بڑھ جائے، دادا سے بھی بڑا آدمی بن جائے، دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔'' ان کی دعائیں گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی شروع ہو جاتیں اور جب ان دعاؤں کا تار ٹوٹتا تو چادر کے اندر سے دونا نکال کر اماں کے سامنے رکھ دیتیں۔ ''بہو، لے لے بہو۔'' پھر رک کر سرگوشی کرتیں ''لے بہو، کھالے۔'' اماں کے لیے ربڑی بالائی کا دونا، چھوٹے بھائی اور بہن کے لیے ریوڑیاں، اور پھر جاتے وقت دونوں کو پانچ پیسہ کا ایک ایک سکہ۔ مہینہ میں چار بار ضرور آتیں اور کل ملا کر کم از کم دو روپے بلاشبہ خرچ کر ڈالتیں، لیکن پانچویں تاریخ ہوئی نہیں کہ آموجود ہوتیں۔ ''بھوللا کا منی آرڈر آیا؟ لاؤ ہمارا خرچہ۔'' اور پھر ڈھیر ساری دعائیں۔

اس وقت تک منی آرڈر نہ بھی آیا ہوتا تو اماں دو روپے ان کے حوالہ کر دیتیں کہ دوبارہ آئیں گی تو ربڑی بالائی کا دونا اور ریوڑیاں بھی لائیں گی اور بچوں کو پانچ پانچ پیسے کے دو سکے بھی ضرور دیں گی۔ وہ منیر کی اماں سے کہتیں، ''منیر کی اماں، تم سارے پیسے تو یہیں خرچ کر ڈالتی ہو۔'' لیکن قبل اس کے والدہ جملہ پورا کر سکیں وہ لقمہ دیتیں ''ہیں بہو۔۔۔ تم نے ایسی بات کیسے کہی۔۔۔ کا للا کی کمائی سے حصہ بٹانا نہیں چاہتیں۔۔۔ اللہ سلامت رکھے میرے للا کو، ہمیں دو روپے بھیجتا ہے۔۔۔ میرا للا۔''

والدہ نے یہ ساری باتیں مجھے خط میں لکھ بھیجیں تو میرا دل ڈول ڈول گیا کہ ایک بار منیر کی اماں کو اور دیکھ لوں، ان کے ہاتھوں کا لمس کم سے کم ایک بار اور محسوس کر لوں۔ میں نے چھٹی کی درخواست بھی دی لیکن ملازمت نئی نئی تھی، چھٹی نہ ملی اور پھر دفتر اور دوسری مصروفیتوں نے منیر کی اماں کی یاد کو میرے ذہن سے محو کر دیا لیکن دو روپے جو دستور بن گئے تھے، برابر جاتے رہے۔

پھر ایک دن والدہ کی علالت کا تار ملا تو میں پہلی گاڑی سے اورئی کے لیے روانہ ہو گیا۔ والدہ کی بیماری کی خبر سے دل بوجھل تھا لیکن گاڑی سے اترتے ہی اسٹیشن کی چہل پہل دیکھ کر یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اب یہ شہر بالکل بدل گیا ہے۔ پہلے سڑکوں کے کنارے جہاں میونسپلٹی کی لالٹینیں لگی تھیں وہاں اب بجلی کے بلب جل رہے تھے، رات گئے پہنچنے والی گاڑی کے مسافروں کو لے جانے کے لیے جہاں مشکل سے کوئی سواری ملتی تھی وہاں اب درجنوں تانگے، رکشے اور چند کاریں بھی کھڑی تھیں۔ بس اسٹیشن کے پاس والا چوراہا جہاں سرشام ہی سناٹا آبیٹھتا تھا، دو بجے رات کو بھی روشن تھا۔ اپنے وطن کی یہ ترقی دیکھ کر دل میں خوشی کی ایک لہر اٹھتی لیکن والدہ کی علالت کی خبر کا بوجھ اس لہر کو ڈبو دیتا۔ خزانچی بازار محلہ کی طرف بڑھتے ہوئے رکشہ جب اس چڑھائی پر پہنچا جس کے ایک طرف مدرسہ تھا اور دوسری طرف منیر کی اماں کا مکان تو میں دسمبر کی اس برفیلی رات میں بھی پوری گردن ہڈ سے باہر نکال کر خود کو منیر کی اماں کے مکان کو دیکھنے کی کوشش سے باز نہ رکھ سکا، لیکن اب وہاں وہ ٹوٹا پھوٹا گھر نہ تھا، ایک عالیشان مکان کھڑا تھا۔ دل کو ایک دھکا سا لگا، اس مکان کے سامنے والے کچے چبوترے کے ایک ایک زرہ کو میرے قدموں اور ہاتھوں نے چوما تھا، یہیں میں نے مٹی کھانی سیکھی تھی، یہیں منیر کی اماں نے خوانچہ والوں سے ایسی ایسی خوش ذائقہ چیزیں مجھے کھلائی تھیں جیسی ساری زندگی میں اچھے سے اچھے ہوٹلوں میں بھی نہیں ملیں۔ لیکن اب وہاں بڑا سا خوب صورت مکان بنا ہوا تھا۔

اماں کی طبیعت اب ٹھیک تھی، دن میں دو انجکشن لگے تھے جن سے بہت فائدہ ہوا تھا۔

کھانسی کم ہوگئی تھی اور بخار بھی اتر گیا تھا لیکن کمزور بہت ہو گئی تھیں۔ میں نے کپڑے تبدیل کرتے کرتے منیر کی اماں کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کئی دن سے آئی نہیں ہیں، لیکن انھیں اگلے ہی دن جانے کہاں سے میرے آنے کی خبر مل گئی اور وہ دس گیارہ بجتے بجتے آبراجیں۔ دعاؤں کی گٹھری کھولنے کے بعد بٹوے سے دس کا سکہ نکالا اور میرے ہاتھ میں رکھ دیا، پھر میرے چہرے کو اپنی آنکھوں کے بالکل قریب لے جا کر اپنی لمبی لمبی کھردری انگلیاں میری پیشانی اور آنکھوں پر پھیرنے لگیں۔ میرا جی چاہا کہ ایک بار منیر کی اماں سے چمٹ کر خوب روؤں، خوب روؤں، اتنا کہ سفر کی ساری تکان اور والدہ کی بیماری سے دل پر چھایا ہوا سارا غبار دھل جائے لیکن میں ان سے چمٹ کے رو نہ سکا؛ یونیورسٹی سے ایم اے پاس، انگریزی کے اخبار میں ملازم، سوٹ بوٹ ڈاٹے رہنے والا شخص گھر کی ملازمہ سے لپٹ کر روئے گا تو دنیا کیا کہے گی۔۔۔ دیکھنے والے کیا کہیں گے!

پھر جب لکھنؤ کے لیے روانہ ہونے لگا تو انھوں نے مجھے اٹھنی دی، بہت ساری دعائیں دیں، میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں "ہاں للا۔۔۔ ہماری تنخواہ پانچ تک ضرور بھیج دیا کرو۔" تنخواہ! دو روپے مہینے کی تنخواہ۔ میں کانپ گیا۔

دس بارہ دن بعد والدہ کا خط آیا۔ اب وہ اچھی تھیں، طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ دوا بھی چھوڑ دی تھی، کچھ گھر کی باتیں تھیں اور خط کے بالکل آخر میں لکھا تھا "پرسوں شام منیر کی اماں کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگلے دن رزاق کی بیوی، سمجھ گئے نا، منیر کی اماں کی بہو، نے بتایا کہ آخر آخر وقت تک للا للا کرتی رہیں۔"

منیر کی اماں مرگئیں۔ منیر کی اماں مرگئیں۔

ایک دن گزرا، دو دن گزرے، پھر ایک ہفتہ گزر گیا، پھر دو ہفتے گزر گئے، منیر کی اماں کی یاد جو پہلے روز آتی تھی اب کئی دنوں سے نہیں آئی اور پھر اگلے مہینہ کی پہلی تاریخ بھی آ گئی۔ میں نے حسب دستور منی آرڈر فارم پر اتنے ہی روپے بھرے جتنے ہر بار بھیجا کرتا تھا اور فارم کاؤنٹر کلرک کے سامنے بڑھا دیا۔ پھر یکایک ایک خیال آیا۔ وہ منی آرڈر فارم واپس لے کر

چاک کر دیا، دوسرا فارم لیا اور دو روپے کم کر کے باقی رقم منی آرڈر کر دی۔

منیر کی اماں کی موت سے زندگی کے معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑا، لیکن اب میں اتنے ہی روپے والدہ کو بھیج کر منیر کی اماں کی توہین تو نہیں کر سکتا۔ قبر میں ان کو اگر یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے بعد بھی اتنے ہی روپوں کا منی آرڈر آتا ہے تو ان کی نظروں میں ان روپوں کی وقعت کتنی کم ہو جائے گی، نہیں خود اپنی وقعت کتنی کم ہو جائے گی۔

■■

نوحہ گر

رومی دروازے کے زینے پر چڑھتے ہوئے دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ اس طرح ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ساتھ ساتھ چلنے کا یہ ان کا پہلا موقع تھا۔

دونوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

چند روز قبل اس نے بڑی ہمت کر کے رخشندہ کے سامنے شادی کی تجویز رکھی تھی اور اس نے سوچ کر جواب دینے کا وعدہ کیا تھا۔ کل اس نے گھنٹہ دو گھنٹہ کہیں تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا تھا اور آج وہ دونوں یہاں چلے آئے تھے۔ ان گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں اس کے ذہن میں نہ جانے کیسے کیسے خیالات آئے تھے، نہ جانے کتنے انوکھے اور نادر جملے سوجھے تھے، لیکن اس وقت تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ تمام باتیں اور وہ تمام خیالات ایک ایک کر کے جہاں سے آئے تھے وہیں واپس چلے گئے ہوں۔

آخر اس نے گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے کہا۔

"اس سے پہلے کبھی یہاں آئی ہو؟"

"ہوں۔" رخشندہ زینے پر چڑھتے چڑھتے رک گئی اور بولی — "ایک بار آئی ہوں۔ امی، باجی، دولہا بھائی، اور بہت سے بچے کچے ساتھ تھے لیکن۔"

"لیکن کیا؟"

"لیکن یہ کہ آج ایسا لگتا ہے جیسے پہلی ہی بار آئی ہوں۔"

’’کیوں؟‘‘ اجمل نے محض سلسلہ گفتگو جاری رکھنے کے لیے پوچھا۔

’’آیا کرو ادھر بھی۔۔۔‘‘ گنگناتے ہوئے ایک صاحب تیزی سے ان کے پاس سے گزر گئے۔ وہ ان دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرائے بھی۔ اجمل نے ان کی طرف گھور کر دیکھا۔ رخشندہ نے اجمل کا موڈ خراب ہوتے دیکھا تو بولی، ’’خواہ مخواہ بور ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا بتائیے آپ اس کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟ ہم لوگ اس جگہ گھنٹہ بھر سے کھڑے ہوئے باتیں کر رہے ہیں، بھلا کوئی تک ہے۔‘‘

بعد میں تیسری منزل کے ایک جھروکے میں بیٹھے بیٹھے دونوں نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزار دیا، ایک ہی طرح کی باتیں نہ جانے کب تک کرتے رہے۔ رخشندہ اجمل کی باتیں اس محویت سے سن رہی تھی کہ اسے ہوش بھی نہ رہا کہ کب اجمل نے اپنے کوٹ کے کالر سے پن نکال کر دیوار پر اس کا پورا نام کھود دیا۔ رخشندہ پروین۔ اور جب رخشندہ نے، جو اس دوران گردن جھکائے اِدھر اُدھر کی باتیں کیے جا رہی تھی، گردن اٹھائی اور اس کی نظر اپنے نام پر پڑی تو بولی، ’’یہ آپ نے کیا کیا۔ یونیورسٹی کا کوئی لڑکا دیکھے گا تو فوراً سمجھ جائے گا کہ میں یہاں آئی تھی۔‘‘

’’جی ہاں ضرور سمجھ جائے گا۔ اجمل نے رخشندہ کے ’’خ‘‘ کو ذرا اور گہرا کرتے ہوئے کہا، اس لمبی چوڑی دنیا میں آپ ہی تو ایک رخشندہ پروین ہیں۔ ارے اس نام کی نہ جانے کتنی لڑکیاں ہوں گی۔‘‘

’’پھر بھی۔۔۔ مٹا دیجیے نا۔‘‘

’’لیکن مجھ سے تو یہ نہ ہو سکے گا۔‘‘

’’اچھا لائیے تو میں مٹا دوں۔‘‘ یہ کہہ کر رخشندہ نے اس کے ہاتھ سے پن لے لیا، اور پھر دھیرے دھیرے اپنا نام کھرچنے لگی۔

اجمل کچھ دیر تو اسے خاموشی سے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

’’میں نے تو اتنی محنت سے لکھا تھا، اور تم نے۔۔۔‘‘

"بات یہ ہے۔۔۔۔" رخشندہ نے، جس کے ہاتھ پر اپنا نام مٹانے سے سفیدی کے چھوٹے چھوٹے ذرے پڑ گئے تھے، اپنے دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا "بات یہ ہے کہ مجھے دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھاتے ذرا کم ہی اچھا لگتا ہے۔ میں تو آرام کی زندگی سے تھک گئی ہوں۔ گھر پر تھی تو امی اٹھ کے پانی نہ پینے دیتی تھیں، جب سے ہوٹل میں آئی ہوں اپنے ہاتھ سے کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ آزادی کا سانس لے پاتی ہوں۔"

اجمل جو اب تک نہایت اعتماد کے ساتھ اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا، خود اپنی ہی نظروں میں پہلے کے مقابلہ میں ذرا کم وقعت ہو گیا۔ نائلون کا یہ پتلون جو اس نے دو مہینے کے ٹیوشن سے بنوایا تھا اب اتنا چمکدار نہ رہ گیا تھا۔ اس نے ابھی تھوڑی دیر قبل سوچا تھا کہ آج اپنی زندگی کے مستقبل کے بارے میں رخشندہ کا آخری فیصلہ معلوم کر لے گا، لیکن رخشندہ اور اس کی سماجی حیثیت کے فرق کے یکا یک اظہار نے جیسے اس سے قوتِ گویائی چھین لی، اس نے سوچا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے دل کی بات زبان پر لے آئے، لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا اور اس نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے کہا۔

"ہاں رخشی، تو اس آزادی کو کس طرح استعمال کرنے کا ارادہ ہے؟"

تخاطب کا انداز اور نام کی اس تبدیلی پر وہ کسی قدر چونکی، لیکن اس حیرت میں خفگی کا کوئی عنصر نہ تھا بلکہ اجنبیت کی دیواروں کا ٹوٹنا اسے کچھ اچھا ہی لگا۔ اس احساس نے اسے اس قدر اپنی گرفت میں لے لیا تھا کہ اسے یہ بھی نہ یاد رہا کہ اجمل نے پوچھا کیا تھا۔

وہ اس خود فراموشی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اجمل نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

"میں نے پوچھا تھا۔۔۔۔"

لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنا جملہ پورا کر پاتا، بائیں طرف کی اوپری برجی سے ایک قہقہہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ دو نوجوان برآمد ہوئے۔ وہ دونوں ذرا ہٹ کر ایک جھروکے کے قریب کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے کو دیوار کی طرف اشارہ

کرتے کچھ دکھایا۔

دونوں کچھ دیر وہیں کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہے، پھر قہقہے لگاتے ہوئے چلے گئے۔

"ذرا چلیے تو، دیکھیں۔" رخشندہ نے غیر ارادی طور پر پہلی بار اجمل کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھیں وہاں کیا لکھا ہے۔"

اجمل اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ کھسکا۔ اس نے رخشندہ کو بٹھاتے ہوئے کہا، "کہو تو میں یہیں بیٹھے بیٹھے بتا دوں، وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اچھا بتائیے، اور اگر غلط ہوا تو؟"

"جو چور کی سزا وہ میری سزا۔"

"نہیں یہ نہیں، کوئی اور سزا۔"

"کیوں، کیا یہ سزا کم ہے؟"

"نہیں۔" رخشندہ نے کہا۔ بات یہ ہے کہ میں چور کو معاف کر دیتی ہوں۔ گرمیوں کی چھٹی میں گھر گئی تھی تو آپا کے لڑکے نے میرے ٹاپس غائب کر دیے۔ مجھے بالکل یقین ہے کہ یہ کام اسی کا تھا، لیکن میں نے اس کا کسی سے ذکر بھی نہیں کیا۔ امی سے بہانہ بنا دیا کہ ہوسٹل میں کہیں کھو گئے تھے۔ امی نے دوسرے بنوا دیے۔"

اجمل نے رخشندہ کے ٹاپس ذرا توجہ سے دیکھے، ان کے بیچ میں زمرد چمک رہا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ کی قیمتی گھڑی اور سونے کی انگوٹھی دیکھی اور پھر اپنے کپڑوں اور جوتوں کی طرف دیکھا، لیکن رخشندہ اس کی یہ گھبراہٹ بھانپ نہ سکی اور بولی، "اس طرح چور کی سزا سے تو آپ صاف بچ جائیے گا۔"

"اچھا تو پھر جو سزا چاہو۔۔۔" اجمل نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے جلدی سے کہا۔

"سزا میں دوں گی لیکن ابھی سے بتاؤں گی نہیں۔ منظور!"

”منظور۔“

”اچھا تو ذرا یہ بتائیے کہ وہاں کیا لکھا ہے؟“

”ہاں بھئی نام وام تو بتانے سے رہا۔“ اجمل نے شعوری طور پر غیر رسمی انداز اختیار کیا۔ ”ان دونوں میں سے کوئی ایک کبھی اپنی منظور نظر کے ساتھ یہاں آیا ہوگا، اور اپنی خواہش لکھ گیا ہوگا۔ ان دونوں کی مسکراہٹوں اور قہقہوں سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی خواہشیں پوری ہوگئی ہیں۔“

”اچھا دیکھا جائے۔“ رخشندہ نے کہا اور دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

اجمل کا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ اس جگہ دو عبارتیں لکھی تھیں۔ ایک میں خواہش کا اظہار تھا اور دوسری میں اس کی تکمیل کا۔ پہلی والی تحریر کسی قدر دھندلی اور مٹی ہوئی تھی جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ شاید دو ایک سال پہلے ہی کی بات ہے۔ اس کے پاس ہی کسی نے موٹے موٹے حرفوں میں کئی جگہوں پر ”سکینہ سکینہ“ لکھ رکھا تھا۔ دونوں کو تشہیر کی یہ ادا پسند نہ آئی اور وہ آگے بڑھ گئے۔

ایک جگہ لکھا تھا۔

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے رہتا ہے

اس کے بالکل پاس ہی کسی نے لکھا تھا، ”رشیدہ، کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔“ نیچے لکھا تھا ”شہاب۔“ شعر کے اوپر ایک ہی جگہ الگ الگ تحریروں میں لکھا ہوا تھا ”شہاب، رشیدہ۔“

”کہیے بوجھ بجھکڑ صاحب، ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ رخشندہ مسکرائی۔

”بھئی یہ تو۔۔۔ ٹریجڈی ہے ٹریجڈی۔“

”کیا آپ اس ٹریجڈی پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟“

رخشندہ نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی گویا وہ کوئی نہایت سنجیدہ بات کہہ رہی ہو، لیکن

پھر فوراً ہی اسے اپنے اس مصنوعی انداز گفتگو پر ہنسی آ گئی۔

اجمل نے بظاہر نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

''روشنی کیا ڈالوں، اندھیروں کی بات ہے۔ ایسا لگتا ہے، محبت کے خواب ناامیدی کے چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے۔ خود تو محترمہ کہیں چین کی بنسی بجا رہی ہوں گی اور یہاں یہ حضرت اب تک اس غم کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔''

رخشندہ نے اسے عورت ذات پر حملہ تصور کیا اور بولی۔

''بڑا تیر مار رہے ہیں، دیواروں پر اس غریب کا نام لکھ لکھ کر خوب اپنا اور اس کا نام روشن کر رہے ہیں۔ نہ جانے بے چاری کن حالات میں بیاہ دی گئی ہوگی۔''

اجمل کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ رخشندہ اس بات کو اتنی دور تک لے جائے گی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ یہ بات اس کے لیے تکلیف کا سبب بن سکتی ہے، وہ بولا۔ ''میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔ میرا مطلب یہ تھوڑی ہی تھا کہ ان حضرت سے وعدہ وعید کر کے اس نے خوشی خوشی شادی رچالی ہوگی۔''

رخشندہ اس کے جواب سے کچھ خجل ہو گئی۔ اصل میں اجمل کو اس طرح شرمندہ کر کے وہ خود پریشان سی ہو گئی تھی۔ اس نے بات کا رخ بدلا اور بولی ''میرا مطلب یہ تھوڑی تھا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ لوگ ایسی باتیں کچھ لکھتے ہی کیوں ہیں۔ محبت کی یہ تشہیر ۔۔۔۔''

''تشہیر نہیں۔'' اجمل نے کہا ''وقت کے سمندر میں سے ایک قطرہ نکال کر اسے منجمد کر لینے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔''

''کیوں کیا وقت کے سمندر میں لہریں اس قدر تیز ہوتی ہیں کہ اس قطرے کو ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ نہیں کیا جا سکتا۔ اب یہی دیکھو، یہ حضرت تو یہاں ایسے آئے ہوں گے جیسے کوئی اپنے کسی عزیز کی قبر پر جاتا ہے، ہار پھول لے کر۔ اور پھر دو منٹ کے غم کے بعد خوش خوش واپس چلا آتا ہے۔ کسی کی یاد کا چراغ مکان کے باہر کی محراب میں جلانے سے اچھا تو یہ ہے کہ کوٹھری کے طاق میں جلایا جائے۔ وہاں اس کی روشنی اور میں کوئی اور شریک تو نہ ہوگا۔''

رخشندہ غیر ارادی طور پر "آپ" اور "دیکھیے" ترک کر کے "تم" اور "دیکھو" پر اتر آئی تھی۔ "اگر ان حضرات نے یہ سب کچھ یہاں نہ لکھا ہوتا تو ہم ان کی دنیا میں کیوں دخل دیتے۔ میں تو اپنے محبت کے شمشان کی آگ سے کسی کو ہاتھ نہ تاپنے دوں گی۔"

رخشندہ نے اپنا جملہ ختم کیا، تو وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ اجمل بھی خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ بات کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں جا پہنچتی ہے۔ اس نے سوچا۔

"کیا بات ہے رخشی، تم خواہ مخواہ ذرا سی بات پر اداس ہو جاتی ہو۔"

"میں اداس کہاں ہوں؟" رخشندہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور داہنی محراب کی طرف جو ہوا اور بارش کی زد سے محفوظ رہنے کی وجہ سے اب بھی سفید تھی، اشارہ کر کے بولی۔

"دیکھیے وہاں شاید آج ہی کل میں کسی نے کچھ لکھا ہے۔"

پینسل کی تحریر صاف نظر آ رہی تھی۔ دونوں چند قدم چل کر اس جگہ پہنچے۔ تو وہاں لکھا تھا "ہم دونوں دو سال قبل یہاں آئے تھے۔ یہی دن تھے، اب ہم ایک ہو چکے ہیں تو اس عہد کو دہراتے ہیں کہ ایک دوسرے کا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں گے۔" اس کے آگے نہ کوئی نام تھا نہ پتہ۔

رخشندہ جو تھوڑی دیر قبل محبت کے بانگ دہل اعلانوں سے چڑسی گئی تھی یکا یک جیسے کھل اٹھی۔

"یہ ادا مجھے پسند آئی،" اس نے اجمل کی طرف دیکھا۔ "ٹھیک ہی تو ہے، اس طرح اپنے دل کی بات لکھ دینے میں تو کوئی حرج نظر نہیں آتا، ہم دونوں بھی کیوں نہ اپنی اپنی خواہشیں یہیں لکھ دیں۔"

"اپنی اپنی خواہشیں۔" اجمل نے "اپنی اپنی" پر زور دے کر کہا۔

"ہوں۔"

اجمل نے رخشندہ کی طرف دیکھا، اور آہستہ سے بولا: "کیا ہماری خواہشیں الگ الگ ہیں؟"

رخشندہ جو پہلے اجمل کے اشارے کو نہ سمجھ سکی تھی، بولی: "یہ میں نے کب کہا تھا۔ اچھا یہ بتائیے کیا لکھا جائے؟"

دونوں تھوڑی دیر تک اس تاریخی عمارت میں اپنے ساتھ ساتھ آنے کی یاد کے طور پر لکھنے کے لیے کوئی مناسب جملہ سوچتے رہے۔ کوئی جملہ اجمل سوچ کے بتاتا تو رخشندہ اسے مسترد کر دیتی، لیکن یہ ضرور کہتی کہ اس سے اچھی بات ممکن ہے۔ اسی طرح رخشندہ کوئی جملہ چنتی تو اجمل کہتا، اس سے اچھا تو میرا ہی خیال تھا۔ آخر طے ہوا کہ دونوں اپنے اپنے ناموں کے پہلے حروف لکھ کر تاریخ ڈال دیں۔

"لیکن یہاں نہیں۔ یہاں تو کوئی بھی جگہ خالی نہیں ہے، کسی ایسی جگہ لکھیں جہاں اس سے پہلے کسی نے کچھ نہ لکھا ہو۔" رخشندہ ہمیشہ سے جدت پسند تھی۔

دوسری منزل کی ان محرابوں اور دیواروں کا شاید ہی کوئی حصہ ایسا ہو جہاں کسی نے کچھ نہ لکھا ہو۔ رخشندہ اور اجمل کسی مناسب جگہ کی تلاش میں دیواروں پر لکھی ہوئی تحریریں اور جملے پڑھتے اور انھیں اپنے تبصرے کا موضوع بناتے رہتے۔ ایک جگہ کسی صاحب نے لکھا تھا۔

"خاقان ابن خاقان، سلطان ابن سلطان والا جاہ ۱۳ جولائی ۱۹۵۶ء کو یہاں تشریف لائے۔"

"خدا کرے آپ آئندہ یہاں کبھی تشریف نہ لائیں۔" رخشندہ نے کہا اور دونوں مسکرا دیے۔

ایک دوسری محراب پر لکھا تھا: "سب جانیں کہ ہمارا نام قیصر حسین ہے۔" کسی صاحب نے لکھا تھا۔

ہم شمع وفا کے پروانے کب جان کی پروا کرتے ہیں
جو آگ لگائی تھی تم نے اس آگ سے کھیلا کرتے ہیں

اسی طرح وہ دونوں دیواروں پر لکھی ہوئی عبارتوں کو پڑھتے اور ان پر تبصرے کرتے رہے لیکن انھیں ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں پہلے سے کسی نے خامہ فرسائی نہ کر رکھی ہو۔ آخر دونوں ایک محراب کے پاس رک گئے۔ اس پر زیادہ لوگوں نے اپنے نام اور خواہشیں نہیں لکھی تھیں۔

دونوں تھوڑی دیر ان تحریروں کو پڑھتے رہے، ایک صاحب نے، جو شاید مدراس سے محض سیر و تفریح کے لیے آئے تھے، اپنا اور شہر کا نام لکھ کر تاریخ ڈال دی تھی اور پاس ہی ذرا اونچائی پر لکھا تھا۔

"خودی کو کر بلند اتنا۔۔۔"

"ان صاحب کا شاید یہ مطلب ہے کہ خودی کو کم سے کم اتنا بلند تو کریں جتنی بلندی پر یہ شعر لکھا ہے۔" اجمل نے کہا اور رخشندہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

یہ دونوں جس جگہ کھڑے تھے اس کے سامنے ہی ایک طرف لکھا تھا "میں اس سال بی۔ اے۔ کر کے کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر لوں گا اور اس کو اپنے گھر لے آؤں گا۔" اس تحریر کے نیچے نہ کوئی نام تھا نہ پتہ۔ ہاں تاریخ بتاتی تھی کہ یہ بات چار پانچ سال ادھر کی ضرور تھی۔ خواہش کے اظہار کا یہ انداز رخشندہ کو بڑا بھایا اور اس نے اجمل کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"جانے یہ صاحب اپنی منظورِ نظر کو حاصل کرنے کے بعد یہاں آئے بھی یا نہیں۔"

اجمل نے ایک بار پھر سامنے والے جملہ پر نظر ڈالی اور کہا Matter of Fact قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں تو شادی کے بعد انھیں یہاں آنے کا خیال بھی نہ آیا ہوگا۔"

"ہونہہ، تم تو بس۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی "ہوسکتا ہے اسے کسی اور شہر میں نوکری ملی ہو اور پھر یہاں آنے کا موقع ہی نہ ملا ہو۔"

"ممکن ہے۔" اجمل نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "بہر حال میری چھٹی حس تو یہ کہتی ہے کہ حضرت اس وقت اپنے دوسرے بچے کو کھلا رہے ہوں گے۔"

رخشندہ شرما کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

اس محراب کے ایک کونے میں رخشندہ نے اجمل کے نام کا "الف" اور اجمل نے رخشندہ کے نام کا "ر" لکھ دیا اور پھر اس کے نیچے تاریخ ڈال دی۔

دونوں خاموشی سے کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، پھر اجمل نے رخشندہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیوں کبھی یہاں آنا ہو گا تو اس جگہ ضرور آؤ گی نا؟"

"کیا آپ نہیں آئیں گے؟"

"میرے ساتھ آؤ گی نا؟"

رخشندہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی خاموشی میں انکار نہ تھا اور شاید وہ جواب بھی دے دیتی، لیکن اسی لمحے دونوں کو احساس ہوا کہ ایک اجنبی ان کے پاس کھڑا ہوا ہے۔

کھلتا ہوا گندمی رنگ، لمبا چھریرا بدن، شیو بڑھا ہوا، خاکی قمیص اور پتلون اور پیر میں پرانی چپلیں۔ ان دونوں نے اس کا یہ حلیہ پہلی ہی نظر میں دیکھا۔ دونوں نے استعجاب اور کسی قدر ناپسندیدگی سے اس کی طرف دوسری بار دیکھا۔ اس بار انھیں اس کے کپڑوں، قد و قامت اور چہرے مہرے کے علاوہ ایک کرب اور بے چینی بھی نظر آئی۔ لیکن شاید دونوں کا شعوری رد عمل الگ الگ تھا۔ اجمل کو اس موقع پر اس کا مخل ہونا کھلا تو رخشندہ کو اس کے میلے کپڑے اور ہونق سی صورت اور اس نے آہستہ سے اجمل سے کہا۔

"ماڈرن مجنوں نظر آتے ہیں، اپنی محبوبہ کا رونا رونے آئے ہوں گے۔"

نووارد پہلے تو ان دونوں کو خاموشی سے دیکھتا رہا، پھر مڑ کر ایک محراب کے پاس کھڑے ہو کر دیوار کی کوئی تحریر پڑھنے لگا۔ چند منٹ تک تو اجمل اسے دیکھتا رہا، پھر دونوں ذرا فاصلے پر ایک دوسری محراب کے نیچے کھڑے ہو کر گومتی کی طرف دیکھنے لگے۔ ان دونوں نے نووارد کو اس طرف جاتے دیکھ کر جہاں تھوڑی دیر قبل وہ کھڑے ہوئے تھے، دوسری طرف رخ کر لیا اور کچھ اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے انھیں کسی تیسرے شخص کی موجودگی کا علم ہی نہ ہو۔

پھر اپنی باتوں میں یہ دونوں ایسے بھولے کہ انھیں خیال بھی نہ آیا کہ وہ شخص وہاں کب تک کھڑا رہا اور کب واپس چلا گیا۔

"تو زندگی کے سفر میں تم میرا ساتھ دو گی نا؟"

اجمل نے رخشندہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

"اجمل!" رخشندہ اس سے کچھ زیادہ نہ کہہ سکی۔

"کوئی بڑی سے بڑی رکاوٹ ہماری راہ میں دیوار نہ بن سکے گی؟"

"نہیں اجمل۔"

اسی طرح ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے پکڑے دونوں مڑے اور آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگے۔ دونوں اس محراب کے قریب تک گئے جہاں تھوڑی دیر قبل انھوں نے اپنے نام کے پہلے حرف لکھے تھے۔ وہ اجنبی اسی جگہ آ کر کھڑا ہوا تھا۔ اجمل نے دیکھا کہ ان کے نام کے پہلے حروف کے پاس ہی ایک نئی تحریر ابھی ابھی ابھری ہے۔ پینسل سے لکھی ہوئی یہ عبارت آس پاس کی تحریروں سے بالکل الگ معلوم ہوتی تھی۔

"دیکھیں تو یہ حضرت کیا لکھ گئے ہیں؟" اجمل نے ذرا آگے جھکتے ہوئے کہا۔

رخشندہ بھی اجمل کے ساتھ یہ نئی تحریر دیکھنے لگی۔ پرانی عبارت کی جگہ پر لکھا تھا: "تم آخر کب تک اپنے وعدہ پر قائم رہتیں۔ میں پچھلے چار برسوں میں سو روپے کی نوکری تلاش نہ کر سکا کہ تمھیں اپنا لیتا۔ میری دلی مبارکباد قبول کرو، خدا کرے تم خوش و خرم رہو!"

دونوں نے خاموشی سے ایک بار پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ دونوں کو خوب اچھی طرح یاد تھا کہ اپنے نام کے پہلے حروف کھودتے وقت انھوں نے آرزوؤں اور تمناؤں کی ایک کہانی دیکھی تھی، اب وہ کہانی غائب تھی۔ دونوں نے غیر ارادی طور پر ایک دوسرے کے ہاتھ چھوڑ دیے اور خاموشی سے نیچے والے زینے کی طرف بڑھنے لگے۔

پیاسے

اوشی کی عادت سے واقف ہونے کی وجہ سے میں نے ساری بات اُسے رات ہی میں تفصیل سے بتادی تھی تاکہ اگلی صبح وہ مجھے روکنے کی کوشش نہ کرے۔ میں نے چار دن کی اتفاقیہ رخصت لی تھی، اس سے پہلے کالج دو دن کے لیے بند تھا، میری رخصت کے بعد کسی تہوار کے سلسلہ میں دو دن کی چھٹی تھی اور اس کے بعد اتوار۔ اب اگر میں دوشنبہ کو یعنی کل کالج نہ پہنچی تو دو دن کی یہ عام چھٹی اور اتوار بھی میری رخصت میں شامل کرلیے جائیں گے اور خواہ مخواہ تین دن کی چھٹیاں ضائع ہوجائیں گی۔

میرے خیال میں یہ دلیل اس قدر وزنی تھی کہ اب اوشی کے لیے کسی اگر مگر کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی لیکن وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی اس لیے میں نے اپنی بات میں اور زیادہ وزن پیدا کرنے کے لیے ایک دوسری دلیل کا سہارا لیا۔ ”تو تو جانتی ہی ہے کہ ہسٹری کا کورس ایک تو یونہی زیادہ ہوتا ہے، پھر دیر سے کالج کھلنے اور اپنی بیماری کے سبب دوبار چھٹی لینے کی وجہ سے سارا کا سارا کورس ویسا ہی پڑا ہوا ہے اور امتحان ہیں کہ سر پر چلے آرہے ہیں۔“

اوشی کو اب بھی خاموش دیکھ کر میں نے ترکش کا آخری تیر چلادیا، ”اگر تو نے کل صبح رونا دھونا شروع کیا تو سمجھ لے اس سے کوئی کام نہ چلے گا اور پھر یہ ہتھیار بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بیکار ہوجائے گا۔

اوشی خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی، ایک لفظ بھی نہ بولی۔ اس کی خاموشی میں انکار تھا نہ اقرار؛ نہ وہ میری سنجیدگی سے متاثر تھی نہ اُسے میرے اس لہجہ پر، جو اس کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا، کوئی حیرت تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس آنکھوں میں جھانک کر اس کی خاموشی کے معنی سمجھنے کی کوشش کی تو بالکل ناکام ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ شاید اسے میری بات بری لگی ہے، شاید میرا لہجہ، بہت زیادہ سخت نہیں تو سپاٹ ضرور ہوگیا تھا اور مجھے اس سے اس انداز سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

اصل میں ہم دونوں کی جذباتی دوستی ہے۔ ویسے تو ساری دوستیاں بنیادی طور پر جذباتی ہوتی ہیں لیکن ان میں کچھ مشترک مقاصد، کچھ مشترک نظریات یا ایک سی دلچسپیاں ہوں تو اکثر یہ دوستیاں زیادہ مضبوط ہو جاتی ہیں لیکن علاوہ اس کے کہ ہم دونوں دو الگ الگ شہروں میں الگ الگ مضامین ڈگری کالجوں میں پڑھاتے ہیں اور دونوں ہی اس عمر کو کئی برس پیچھے چھوڑ آئے ہیں جب لڑکی کو شادی کے قابل سمجھ لیا جاتا ہے، ہم دونوں میں اور کوئی بات مشترک نہیں؛ اور یہ بھی کہ ہم نے اپنے مضامین، اپنے کالجوں اور اپنی شادیوں کے بارے میں اس وقت کے علاوہ جب ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تھے، شاید کبھی بات نہ کی تھی۔

اوشی اب بھی پہلے ہی کی طرح خاموش بیٹھی تھی۔ میں اپنے صوفہ پر سے اُٹھی اور ہم دونوں کے درمیان جو خالی صوفہ پڑا تھا اس پر بیٹھ گئی اور میں نے اپنے اوورکوٹ کی جیب میں سے بایاں ہاتھ نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا جو بہت دیر سے ایک ہی طرح صوفے کے ہتھے پر پھیلا ہوا تھا۔

"دیکھ کل کوئی شرارت نہ کرنا، سچ اوشی مجھے بہت ضروری جانا ہے۔"

وہ یکایک ہنس دی اور اس کی آنکھوں میں وہ مخصوص چمک پیدا ہوگئی جسے میں بیان تو نہیں کرسکتی لیکن یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ اس چمک کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ "سدرشن دیدی" کہنے ہی والی ہے اور ہوا بھی یہی۔

"نہیں سدرشن دیدی ۔۔ میں تو تمھیں کل نہیں روکوں گی۔"

"جب اتنی ہی آسانی سے مان جانا تھا تو پھر اتنی دیر سے خاموش کیوں بیٹھی تھی؟" میں نے خوش ہو کر کہا لیکن میرے دل کے اندر، بالکل اندر، اُداسی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی کہ ہائے یہ تو اتنی آسانی سے مان گئی۔

میں نے اپنی اس ذہنی کیفیت کو اوشی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"میری اچھی اوشی، ہائے تو کتنی اچھی ہے۔"

لیکن اگلی صبح اوشی اپنی حرکت سے باز نہ آئی۔ خود تو منھ اندھیرے ہی اُٹھ گئی، میرے لیے چائے بنا کر لائی اور سرہانے رکھ دی، لیکن نہ مجھے جگایا نہ خود چائے پی، اور ناشتہ بنانے لگی۔ ناشتہ بھی کیا، ڈبل روٹی تو گھر میں موجود ہی تھی، بس اس نے دو انڈے اُبال لیے تھے، اور اس خیال سے کہ جنوری کی دہلی کی سردی میں پلیٹ میں ذرا سی دیر میں ٹھنڈے ہو جائیں گے اور اُنہیں چھیلنے میں دقت ہوگی اس نے انھیں پتیلی ہی میں رہنے دیا تھا۔

اخبار والے کی آواز سے میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ گھرے کہرے کی وجہ سے سورج کی کرنیں ہلکی اور پیلی تھیں، لیکن اس کے باوجود وقت کا اندزہ لگانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میں نے تکیے کے نیچے سے گھڑی نکالی تو سات بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ ایک بس ٹھیک آٹھ بجے جاتی تھی اور میں بس سے اُتر کر سیدھے کالج جا سکتی تھی اور اپنا کلاس بھی لے سکتی تھی۔

میں نے پیالی پر ہاتھ رکھا تو وہ ٹھنڈی پالا ہو رہی تھی۔ اوشی نے کمرہ میں کھٹ پٹ سنی تو کچن سے ایپرن پہنے اور اپنی مخصوص مسکراہٹ لیے جس میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی شرارت چھپی ہوتی ہے، آگئی۔

"دیدی اب اُٹھ بھی جاؤ۔" اس نے کہا۔ "کب سے جگا رہی ہوں۔ میں ابھی چائے لائی۔" اور قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں، اس نے پیالی اُٹھائی اور غڑاپ سے کمرہ سے کچن میں چلی گئی۔

میں نے رات ہی میں ہولڈال پھیلا کر اس میں چٹ پٹ چیزیں ڈال دی تھیں۔ اب میں نے جلدی جلدی لحاف، گدے اور تکیے اس پر پھیلا دیے اور اسے کسنے میں مدد کرنے کے لیے اوشی کو آواز دینے جا رہی تھی کہ وہ گرم گرم چائے لے کر آ گئی، دس پندرہ منٹ میں کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے میں تیار ہو گئی اور اوشی نے پارک کے پاس والے موڑ پر گزرنے والے ایک اسکوٹر رکشہ کو ہاتھ سے اشارہ کر کے بلا لیا۔

اسکوٹر رکشہ جب تیسرے مکان کے بعد بائیں طرف مڑنے لگا تو میں نے جھانک کر دیکھا۔ اوشی باہر لوہے کے پھاٹک سے سر ٹکائے کھڑی تھی اور اس کی نظریں اسکوٹر رکشہ کا تعاقب کر رہی تھیں۔

میں بس میں داخل ہوئی تو ساری سیٹیں بھر چکی تھیں، پھر بھی میں نے اطمینان کرنے کے لیے ڈرائیور کی سیٹ تک جا کر دیکھا تو آگے سے تیسری سیٹ پر ایک جگہ خالی تھی۔ اس سیٹ پر گردن کے اوپر کانوں تک چسٹر کا کالر چڑھائے ایک شخص کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن کچھ تو وہ ذرا دہرے بدن کا تھا، کچھ شاید پھیل کر بیٹھا تھا اور کچھ جگہ اس کے چسٹر نے گھیر رکھی تھی جس کی وجہ سے پوری سیٹ گھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ ارادتاً اس طرح پھیل کر بیٹھا ہو اور اُس کا کوئی ساتھی کسی کام سے باہر گیا ہو یا پھر اسے کسی کا انتظار ہو۔ میں نے سوچا لیکن اسی لمحہ میرے دماغ نے دلیل دی کہ میں نے ٹکٹ لیا ہے تو میرے لیے سیٹ بھی ہوگی۔ یہ سوچ کر میں نے ایک بار پھر ایک ایک سیٹ پر نظر دوڑائی۔ کوئی بھی سیٹ خالی نہ تھی۔ میں ایک لمحہ کے لیے جھجکی لیکن پھر ہمت کر کے میں نے اسی سے پوچھ لیا۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''

اس نے دھیرے دھیرے اپنی گردن موڑی، مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اس دیکھنے میں تقریباً ایک منٹ لگا دیا جو مجھے ذرا کھلا۔ میں چھوٹے سے قد کی دبلی پتلی لڑکی ہوں اور مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھنے میں بھی اتنی دیر لگنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''جی نہیں، میرا مطلب ہے میں نے یہ سیٹ کسی کے لیے روک نہیں رکھی ہے۔'' اس کے ذہن میں میرا سوال گڈ مڈ ہو گیا تھا۔

اب اس نے ذرا تکلف سے اپنا بدن کھڑکی کی طرف کھسکایا، پھر چسٹر کو برابر کیا اور دوسرا ہاتھ بھی کھڑکی پر رکھ دیا۔ اس طرح اس کا سارا جسم تھوڑا سا کھڑکی کی طرف جھک گیا، سیٹ پر کافی جگہ ہو گئی، اور میں آرام سے بیٹھ گئی۔

ٹھیک آٹھ بجے بس اسٹارٹ ہوئی تو فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ کہیں اوشی اب بھی اسی طرح دروازہ سے ٹیک لگائے نہ کھڑی ہو۔

جب تک شہر کی حدیں ختم نہیں ہو گئیں وہ اس سردی میں کھڑکی کھولے، اپنی آدھی گردن نکالے، عمارتوں، لمبی لمبی موٹروں، دودھ گاڑیوں اور دفتروں کے لیے لمبے لمبے کیو بنائے ہوئے سرکاری ملازموں کو ایک ٹک دیکھتا رہا۔۔۔ ملٹری کلر کی ایک کار پاس سے گزری تو اس کا ہاتھ خود بخود سیلوٹ کے لیے اُٹھ گیا۔ مجھے سردی لگ رہی تھی، میرا جی چاہا کہ اس سے کہوں بھائی، ذرا کھڑکی بند کر دیجیے، آپ کو نہ سہی، مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ لیکن ایک تو یہ کہ اس نے سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت دینے کے بعد ایک بار بھی میری طرف دیکھا نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں اس کی تنہائی میں مخل ہوئی ہوں، اس لیے کہ اس سے کچھ کہنے کی مجھے ہمت نہیں ہوئی۔

سچ پوچھیے تو اس کی اس بے نیازی سے مجھے تھوڑی سی تکلیف بھی تھی۔ حالانکہ مجھے ایم۔ اے کیے پچھے، سات سال ہو چکے تھے اور میں کوئی ایسی خوبصورت بھی نہیں تھی کہ لوگ پلٹ پلٹ کر دیکھیں لیکن یہ بھی سچ تھا کہ میں نے شادی کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے نہ سوچنے کے باوجود ارادی طور پر نہ سہی تو شاید غیر ارادی طور پر ہی اپنی عمر کو باندھ سا رکھا تھا اور آپ مجھے ایک نظر دیکھ کر کسی طرح چوبیس پچیس برس سے زائد کی لڑکی نہیں قرار دے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ میرا رنگ بھی کھلتا ہوا گندمی تھا اور ناک نقشہ درست ہی نہیں بلکہ سبک اور میں ایسی ہرگز نہ تھی کہ یا کم سے کم خود کو ایسا نہ سمجھتی تھی کہ کوئی نوجوان بس کی ایک ہی سیٹ

پر بالکل قریب تقریباً سٹے ہوئے بیٹھ کر اس طرح بے تعلق بنا رہے۔

شہر کی چہل پہل ختم ہوئی تو اس نے اپنا سر اندر کیا، ایک بار کنکھیوں سے مجھے دیکھا، لیکن ذرا تکلف سے؛ اپنا دایاں ہاتھ جو کھڑکی پر رکھے رکھے بے حد ٹھنڈا ہو گیا ہوگا، چسٹر کی جیب میں ڈالنے کی کوشش کی تو وہ میری کہنی سے ٹکرا گیا جو تقریباً آدھا ہاتھ کوٹ کے اندر ہونے کی وجہ سے جیب کے اوپر جھول رہی تھی، لیکن اس نے رسماً بھی ''ساری'' نہیں کہا۔ بایاں ہاتھ جیب سے نکالنے کے لیے وہ ذرا میری طرف جھکا تو اس کے ہاتھ کا بوجھ میں نے اپنے بازو پر محسوس کیا لیکن اس کے لیے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ گھڑی دیکھنے کے لیے اس نے دوسرے ہاتھ کی مدد لیے بغیر چسٹر کی آستین اوپر کرنے کی کوشش کی اور اس کے جسم کا بوجھ پھر میرے جسم پر پڑا تو میں نے پاس والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب کے ہاتھ کی گھڑی میں وقت دیکھ کر کہا۔

''ابھی صرف بیس منٹ ہوئے ہیں۔''

اس نے اپنی گھڑی دیکھنے کی کوشش چھوڑ دی، لیکن ''شکریہ'' بھی نہیں کہا، اور دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈال لیا، ذرا سا سر اونچا کر کے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سردار جی کی پگڑی سے آگے دیکھنے کی کوشش کی، میری طرف گردن موڑی اور پوچھا۔

''آپ میرٹھ جائیں گی؟''

''جی ہاں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اس نے اپنا چہرہ پھر سامنے کی طرف کر لیا۔ مجھے اپنے اس مختصر سے جواب پر کچھ افسوس ہوا لیکن میں جو دل میں اس سے کچھ کچھ ناراض تھی، آخر اس سے کس طرح مختلف تھی؟ میرا مطلب ہے کہ میرا رویّہ اس کے رویّہ سے کس قدر مختلف تھا۔ اس نے مختصر سا سوال کیا، میں نے اس سے بھی مختصر جواب دیا۔۔۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ جب اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے جگہ دی تھی تو میں نے بھی اس کا شکریہ تک ادا نہیں کیا تھا، پھر بھلا مجھے کیا حق تھا کہ وقت بتانے کے بعد اس سے شکریہ کی توقع رکھوں اور جب اس نے پہل کر کے مجھ سے یہ پوچھ ہی

لیا تھا کہ میں کہاں جا رہی ہوں تو مجھے بھی جواب دینے کے بعد اس سے یہ ضرور پوچھنا چاہیے تھا کہ آپ کہاں تک جا رہے ہیں اور یہ بات اس وقت کس قدر آسان تھی۔ ”اور آپ؟“ ہی تو کہنا تھا۔ لیکن اب اس گفتگو کو اتنی دیر ہو چکی ہے کہ اس مختصر سے فقرہ سے کام نہیں چلے گا اور مجھے پورا جملہ ”اور آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں“ کہنا پڑے گا۔ میں نے ہمت کر کے اس سے یہ بات دریافت کرنے کا ارادہ کیا لیکن ہوا یہ کہ جب میں اس سے مخاطب ہوئی تو صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

”اور آپ؟“

وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں ہلکا سا طنز بھی تھا اور ہلکی سی اداسی بھی۔ مجھے اس کی مسکراہٹ بھی اچھی لگی، طنز بھی اور اُداسی بھی۔

”جی ہاں، میں بھی میرٹھ جا رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا اور میری طرف دیکھ کر کہا، ”لیکن یہ بات پوچھنے میں آپ نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟“

میں اس کے اس سوال کا جواب کیا دیتی۔ شاید اس نے یہ سوال جواب کے لیے پوچھا بھی نہ تھا بلکہ سچ پوچھیے تو اس میں جواب پوشیدہ تھا ہی۔ میں خاموش رہی۔

اس کے بعد ہم دونوں کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ نہ اس نے کچھ پوچھا، نہ میں نے خود سے کچھ بتایا۔

بعض لوگ ایک جملہ سے، اپنی ایک ادا سے، گفتگو کرنے، سر کو جنبش دینے، چلنے پھرنے، بیٹھنے، سگریٹ پینے یا اپنے کسی ایک انداز سے آپ کی شخصیت پر چھا جاتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کا وہ بھی تھا۔ میں نے انگلیوں پر اس کے کہے ہوئے الفاظ گنے، کل تیس پینتیس الفاظ تھے، لیکن کتنے گہرے، بالکل اس کی آنکھوں کی طرح۔ میں راستہ بھر اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ کتنی ہی بار میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا، بال بے ترتیبی سے پیشانی پر ایک طرف پھیلے ہوئے تھے جنھیں وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر ہٹا دیتا تھا۔ پیشانی چوڑی تھی، بھویں گھنی اور بے حد سیاہ، نیچے کے ہونٹ ذرا موٹے لیکن اس کے

چہرے پر بے حد مناسب لگتے تھے، قد پانچ فٹ چھ انچ تو ضرور ہوگا۔ میں نے سوچا، پھر اپنے بارے میں سوچا، پھر اس کے بارے میں سوچا، پھر اپنے بارے میں سوچا، اور یہ سلسلہ اُس وقت ختم ہوا جب بس ریلوے کراسنگ پر سے گزر کر میرٹھ شہر میں داخل ہوگئی۔ اس سارے دوران وہ خاموشی سے بیٹھا رہا، ایک آدھ بار اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا ضرور، لیکن کہا کچھ نہیں۔

بس اسٹیشن جب بالکل قریب آپہنچا تو میں نے اپنا بایاں ہاتھ کوٹ کی جیب سے نکالنے کی کوشش کی لیکن میرا ہاتھ جیب سے باہر ہی اس کے چسٹر پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ کھسکایا۔ میرے اس عمل میں کسی ناراضگی، کسی غصہ، حد یہ ہے کہ کسی اجنبیت تک کا اظہار نہ تھا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اپنے ہاتھ سے دھیرے دھیرے زور دے کر میرے ہاتھ کو اپنی موجودگی کا احساس بھی نہیں دلایا۔

بس رُکی اور مسافر دھیرے دھیرے اُترنے لگے۔ میں اسی طرح خاموش بیٹھی رہی، اپنے آپ کو اور دوسروں کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ اس انتظار میں ہوں کہ ذرا بھیڑ کم ہو تو اُتروں۔ پھر میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی، اور جان بوجھ کر اٹیچی اٹھانے میں دیر لگائی کہ میرا ہم سفر بھی تیار ہو جائے تو۔۔۔

اب اس نے چسٹر کو ذرا برابر کیا، دائیں طرف جھک کر کھڑکی کے پاس، اپنے چسٹر کے نیچے کچھ تلاش کرنے لگا۔ کچھ کھٹ پٹ ہوئی، ایک ہاتھ پر ذرا زور ڈال کر وہ سامنے والی سیٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا۔ پھر اس نے بیساکھیاں اسی تکلف سے اپنی بغلوں کے نیچے جمالیں اور جم کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے اب پھر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جس میں شاید ہلکا سا طنز تھا، شاید ہلکی سی اُداسی بھی، اور کھٹ کھٹ کرتا ہوا بس سے اُتر گیا۔

کالج پہنچ کر میں نے سوچا کہ حسب دستور اوشی کو فون کر دوں، لیکن ارادہ بدل دیا اور پرس سے پوسٹ کارڈ نکال کر ایک سطر لکھ دی۔

”اوشی تو نے مجھے آج آنے ہی کیوں دیا، روک کیوں نہ لیا۔“

اپنی لکھی ہوئی سطریں نے ایک بار، بلکہ شاید کئی بار پڑھی اور پھر اس طرح کاٹ دی کہ اسے پڑھا نہ جا سکے۔ کچھ دیر سوچتی رہی، پھر یکایک پوسٹ کارڈ پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے فرش پر پھینک دیا اور تقریباً بھاگتی ہوئی کلاس میں چلی گئی۔

■ ■

اندھیرے کا کرب

میں نے قلی کے ہاتھ میں ایک روپیہ رکھا اور آہستہ سے کہا۔

’’سونے کی جگہ دلا دو تو اُٹھنی اور۔‘‘

قلی نے میری طرف ذرا تعجب سے دیکھا، پھر مسکرایا اور پورے پلیٹ فارم کا ایک چکّر لگانے کے بعد بالکل اسی جگہ سے جہاں ہم دونوں میں ایک زبانی معاہدہ ہوا تھا ریلوے یارڈ میں داخل ہو گیا۔ میں پیچھے پیچھے وہ آگے آگے۔ ’’بابو جی تار ہے‘‘ اس نے پٹریوں کے دونوں جانب لگے ہوئے تاروں کو پھلانگتے ہوئے کہا۔ ’’ذرا احتیاط سے‘‘ اور آگے بڑھ گیا۔ پھر تین پٹریاں اس نے پار کیں، دو گاڑیوں میں داخل ہو کر نکلا اور ایک ڈبہ میں داخل ہو گیا۔ ڈبہ بڑا تھا، چاروں طرف بالکل اندھیرا تھا، ساری سیٹیں خالی تھیں۔ اس نے ایک سیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ’’اس پر بیٹھ جائیے، اوپر چادر بچھا دیجیے، گاڑی چلے تو سو رہیے گا۔‘‘

میں نے سگریٹ جلاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے جیب میں سے ایک روپے کا نوٹ نکالا تو اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، اُٹھنی نکالنے کے لیے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔ ایسی ٹرین میں جس میں بیٹھنے کی جگہ تک ملنا محال ہو، اگر سونے کی صورت نکل آئے تو دو روپے زیاد ہرگز نہیں میں نے سوچا۔ اس نے سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔

میں نے چادر اوپر والی برتھ پر بچھا دی اور بریف کیس کو تکیہ کے طور پر استعمال کرنے کے لیے کونے میں رکھ دیا۔ چادر برابر کرنے کے لیے دوسرے کونے پر گیا تو ڈبہ میں دو تین بیڑیاں چمکتی نظر آئیں۔ اتنے بڑے کمپارٹمنٹ کا تھوڑی دیر کے لیے سہی بلا شرکت غیرے

مالک ہونے کی جس خوشی نے مجھے تھوڑی دیر قبل سرشار کیا تھا اس میں کمی ضرور ہو گئی لیکن خوش میں اب بھی تھا۔ سونے کی جگہ تو پکی ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں کچھ اور لوگ آ گئے، پھر کچھ اور۔ اور اس کے بعد تو جیسے مسافروں کا تانتا بندھ گیا۔ پہلے لوگ بالکل خالی برتھوں پر بیٹھے، پھر کم بھری برتھوں پر، پھر جس کو جہاں جگہ ملی۔

بیڑی کے دھوئیں، لوگوں کی بات چیت، بچوں اور عورتوں کی آوازیں اور گندے میلے اور صاف جسموں کی بُو نے، جس میں میرے جسم کی بُو بھی شامل رہی ہو گی، مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر پلیٹ فارم پر ہی کھڑا رہتا تو کم از کم صاف ہوا تو ملتی لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اوپر والی برتھ پر میری چادر بھی بچھی ہے اور سونے کے لیے جگہ بھی محفوظ ہے، پلیٹ فارم سے گاڑی میں داخل ہوتا تو یہ صورت نہ ہوتی۔ اس دماغی جمع تفریق کا سلسلہ ٹوٹا تو سامنے والی برتھ پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کا جملہ میرے کانوں سے ٹکرایا۔

”صاف ستھری زمین، نہ لکڑی نہ کوئلہ، بس ہاتھ رکھا تو لال بھبھوکا انگاروں کا ڈھیر لگ گیا۔

اس نے بیڑی کا ایک لمبا کش لگایا۔

”بھگوان کی مایا ہے۔ بڑی شکتی ہے، پرانے پرانے روگی جنھیں بڑے بڑے ڈاکٹر جواب دے چکے تھے، ہاتھ لگاتے ہی بھلے چنگے کر دیے۔“

بائیں طرف کسی مسافر نے بکس کھینچا تو وہ میرے پیر سے ٹکرایا، میں نے جھک کر گٹّے پر ہاتھ پھیرا، پھر کھڑے ہو کر اوپر والی برتھ پر ایک نظر ڈالی تو دوسرے کونے پر کسی نے اپنا تھیلا رکھ دیا تھا۔ میری چادر اسی طرح بچھی تھی، سرہانے بریف کیس رکھا تھا۔

”ہمرے گاؤں میں بھی ایک بجُرگ تھے۔“

میری ہی برتھ سے ایک آواز آئی۔ ”بڑی کرامت کے مالک رہن۔ دن بھر سڑک کے کنارے بیٹھے رہن۔ کبھی کبھی کَبر کے سرہانے کڑکڑاتے جاڑے میں جب رجائی، لحاف کے اندر سردی لاگت ہے، وہ درکھَت کے نیچے کھلے میں بیٹھے رہن۔ نہ گرمی سے پریسان نہ جاڑے سے، نہ کبھی کسی سے کچھ مانگتے دیکھا نہ کچھ کھاتے پیتے؟“

"کبھوں کھانا بھی نہ کھات تھے؟" کسی نے یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت سے پوچھا تو اُس شخص نے جواب دے دیا۔ "کسی نے تو دیکھا نہیں، پھر ایک دن گائب ہو گئے۔ اکثر گائب ہو جاتے تھے، مہینہ مہینہ بھر کے لیے۔ پھر ایک دم آجاتے تھے۔ پر اَب دو سال ہو گئے لوٹ کے نہ آئے، گاؤں والوں نے ان کی سمادھی بنا دی ہے۔ اب وہاں ہر سال عُرس ہوت ہے، عُرس۔"

"کھوں، کھوں، کھوں۔" اس پر زوردار کھانسی کا دورہ پڑا ورنہ شاید وہ اپنی بات جاری رکھتا۔ اتنے میں کسی نے بیڑی سلگانے کے لیے دیا سلائی جلائی تو میں نے ایک ہی نظر میں سارے چہروں کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ ایک داڑھی، شاید بال سفید، سر کے بال آدھے کالے، دو بڑی بڑی مونچھیں، لیکن پورا چہرہ نہ دیکھ سکا، کندھے پر رومال پڑا تھا۔ دو تین بچے، ایک خاصی میلی قمیص پہنے ہوئے، ایک بالکل ننگا، تین چار عورتیں، شاید معمولی کپڑوں میں، ایک سفید پوش نوجوان اور ایک مَیں۔ ادھر اُدھر دو چار لوگ اور تھے لیکن اتنی دیر میں دیا سلائی بجھ چکی تھی۔

اسی وقت کسی مسافر پر کھانسی کا دورہ پڑا۔۔۔ پرانی کھانسی، اٹک اٹک کر، رُک رُک کر: اس طرح کھوں کھوں کی آواز کہ عمر کا اندازہ کرنا مشکل بات نہ تھی۔ یہ آواز ٹوٹی ہی تھی کہ کسی نے ٹوٹے ہوئے سروں کو جوڑا۔

"یہ تو کلجگ ہے کلجگ، لوگ سادھو سنتوں کا بھی جال کرنے لگے ہیں۔ جسے دیکھو سادھو بنا گھومتا ہے، بدن پر بھبھوت مل لی کسی قبر پر بیٹھ گئے، دنیا کا موہ بھی ہے، روپے بھی جمع کر رہے ہیں اور سادھو بھی بنے ہیں لیکن اگر کبھی قسمت سے اصلی سادھو مل جائے تو جیون کا کلیان ہو جاتا ہے۔" اس نے اپنے ساتھ برتھ پر بیٹھے یا شاید لیٹے ہوئے بچے کو پیار کیا۔ مجھے یہ پہچان پیار کے چٹخارے اور اندھیرے کی روشنی نے دی۔ اس نے کہا۔ "آپ کو کیا بتاؤں، شادی کو سات سال ہو گئے، کوئی اولاد نہ تھی۔۔۔ مل سے ایک دن تھکا ہارا لوٹا ہی تھا کہ دروازے پر کسی نے صدا لگائی۔۔۔ "جو ایک چٹکی آٹا دے بھگوان اس کی گود ہری کرے۔" عورت کو

بچے کا موہ مرد سے زیادہ ہوتا ہے۔ میری بیوی بٹلوئی بھر آٹا لے کر چلی تو میں نے ٹوکا۔ "رہنے دے رے، ایسے ایسے سادھو بہت دیکھے ہیں۔" میں نے یہ بات دھیرے سے کہی تھی، باہر تک بھلا کیا آواز گئی ہوگی لیکن سادھو مہاراج نے باہر ہی سے آواز لگائی۔ "کیوں دل میلا کرتا ہے، سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے۔۔۔ اگلے بھادوں میں بیوی کی گود نہ بھری ہو تو کہنا۔ تو بھی کیا یاد کرے گا۔" مجھے یہ آواز جیسے اوپر سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ فوراً تخت سے اُٹھ کر باہر بھاگا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ سامنے دور تک سڑک خالی پڑی تھی، نہ کوئی سادھو تھا نہ سنت، کیا بتاؤں سادھو مہاراج کا ایک ایک شبد سچ نکلا۔ اب وہ مہاتما مل جائیں تو ان کے چرنوں کی دھول اپنے ماتھے پر لگا کر معافی مانگوں، مجھے تو کبھی کبھی بڑا ڈر لگتا ہے۔"

وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اسی وقت کسی نے کہا۔۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں، سچے سادھو آشیرواد ہی دیتے ہیں، کسی کا برا نہیں چاہتے۔"

اب میری تخیل اپنے بازو پھیلا چکی تھی۔ میں نے کھانس کر گلا صاف کیا اور پورا پلاٹ ذہن میں تیار کیے بغیر پہلا جملہ داغ دیا۔

"اب میں آپ لوگوں کو اپنی آنکھوں دیکھا واقعہ سناتا ہوں۔" میں لوگوں کا ردعمل معلوم کرنے کے لیے ایک منٹ کے لیے خاموش ہوا تو کسی نے کہا، 'کیا ہوا تھا بھیا؟"

"پچھلے سال میں اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں جگدل پور گیا تھا، وہی راجہ بستر والا جگدل پور۔ وہاں ایک بزرگ کے ان دنوں بڑے چرچے تھے، ایک درخت کے نیچے دن رات بیٹھے رہتے، لوگ طرح طرح کے کھانے، پکوان لاتے اور ان کے سامنے رکھ دیتے، جی چاہا تو ایک آدھا نوالا کھا لیا، نہیں تو کھانا یوں ہی رکھا رہتا، جو آتا سلام کرتا، کسی کے سلام کا جواب دے دیا تو وہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا۔"

میں نے اپنی کہانی کا تاثر معلوم کرنے کے لیے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنا چاہا، لیکن وہاں تو بالکل اندھیرا تھا پھر بھی لوگوں کی خاموشی سے یہ اندازہ ہوا کہ ان کے دل میں میری بات یقین کی جگہ پا رہی ہے۔ اس دوران میں نے کہانی کی کچھ اور چولیں بٹھا

لی تھیں۔

''میں ایسی باتوں کو مانتا نہیں لیکن جب میرے رشتہ داروں نے بہت زور دیا تو ایک شام ان سب کے ساتھ میں بھی شاہ صاحب کے پاس چلا گیا، وہاں پہنچتے ہی میں نے کہا۔

شاہ صاحب! السلام علیکم

''اس وقت شاہ صاحب اپنے جسم کو اس طرح ہلا رہے تھے، جیسے مٹکے میں کوئی چیز بھرتے وقت زیادہ جگہ بنانے کے لیے لوگ اسے ہلاتے ہیں۔ سلام کا انھوں نے کوئی جواب نہ دیا، پھر ایک دم بولے۔۔۔ 'وعلیکم، جا جا کیوں آیا ہے، میں جھوٹا ہوں، میں جھوٹا ہوں۔۔۔ میں جھوٹا ہوں۔''

سب نے میری طرف دیکھا، میری پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ پھر بھی میں بات آگے بڑھائی، شاہ صاحب نے کہا'' جا، بابا۔ دیکھ لینا، میں سچا ہوں، میں سچا ہوں۔''

''شاہ صاحب نے آپ کے دل کا حال جان لیا۔'' کسی نے سوال کیا

''ہاں بھائی۔۔۔! میں تو سچ مچ ڈر گیا تھا۔ میں نے کہا اور اپنی کہانی کو ایک اور موڑ دیا۔

''خیر کچھ دنوں بعد میں اس بات کو بھول گیا اور واپسی کے لیے روانہ ہوتے وقت اس کی کوئی بھی یاد میرے دل و دماغ میں نہ تھی لیکن جوں ہی رائے پور کے لیے میری بس چلی سامنے ایک چبوترے پر شاہ صاحب بیٹھے تھے، ان کے چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ تھی، ان کی آنکھیں میری طرف نہیں تھیں، لیکن مجھے لگا کہ وہ آنکھیں جیسے مجھے ہی گھور رہی ہوں۔ خیر پھر میں تھوڑی دیر میں اس واقعہ کو بھول کر پہاڑوں کے مناظر میں کھو گیا لیکن صاحب آپ یقین نہیں کریں گے، جگدل پور سے رائے پور تک جہاں جہاں بس رکی، میں نے شاہ صاحب کو بس کے آس پاس ہی کہیں نہ کہیں بیٹھے ضرور دیکھا اور پھر جب لکھنؤ میں رکشہ میں بیٹھ کر گھر جا رہا تھا تو رکاب گنج کے پل کے پاس کیا دیکھتا ہوں کہ وہی شاہ صاحب آگے آگے پیدل چلے جا رہے ہیں۔ میں نے فوراً رکشہ رکوایا اور معافی مانگنے کے لیے ان کی طرف جو بڑھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ اب بھی ان کا خیال آجاتا ہے تو مارے ڈر کے۔۔۔''

"نہیں، نہیں،" کسی نے اتنا ہی کہا تھا کہ انجن گاڑی سے دھیرے سے ٹکرایا اور ان صاحب کی آواز انجن کی گاڑی سے لگنے کی آواز میں ڈوب گئی۔

چند منٹ کے بعد گاڑی پانچ چھ بار پٹریاں بدل کر پلیٹ فارم پر آ گئی، بجلی جل اُٹھی، پنکھے چلنے لگے۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر اُن صورتوں کو پہچاننے کی کوشش کی جو اس افسانے کے کردار تھے لیکن اپنے علاوہ کسی اور کی صورت نہ پہچان پایا۔

کیا یہ کہانی میں نے ہی بُنی تھی؟ کیا یہ کہانی میں نے ہی بُنی تھی؟" میں نے سوچا۔

مسافروں کا ایک ریلا آیا تو ڈبے میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ میں خود کو بے حد بے آرام محسوس کر کے اوپر والی برتھ پر منتقل ہونے کے لیے کھڑا ہوا تو وہاں کوئی صاحب لیٹے خراٹے لے رہے تھے۔ میری چادر تہہ کر کے انھوں نے کونے میں رکھ دی تھی اور اپنا بستر بچھا دیا تھا، بریف کیس چادر کے اوپر ہی رکھا تھا۔

راستے بھر میں سوچتا رہا کہ اگر اس وقت بھی جب گاڑی یارڈ میں کھڑی تھی، ڈبے میں روشنی ہوتی تو کیا ان کہانیوں کا وجود ممکن ہوتا؟

○ ○ ○

روح سے لپٹی ہوئی آگ

سوکھی گھاس، نئے نوٹوں کے طرح کڑکڑاتے نعرے جو سکہ رائج الوقت بنے ہوئے ہیں، ہر چنگاری کو قبول کرنے اور بھڑکتے ہوئے شعلہ میں تبدیل کر دینے والا دماغ۔۔۔ ہر دوسرا شخص یا چند اشخاص کا گروہ، جو میں نہیں ہوں، یا ہم نہیں ہیں، سازشیں بنتی ہوئی آنکھیں، مسکراہٹوں کو کدورتوں، نفرتوں اور عداوتوں میں رنگ دینے والے ذہن سے جڑی ہوئی دو آنکھیں۔ ان میں سچ مچ کی چنگاری اگر آج اڑ کر نہ آپڑی تو کل آپڑے گی، کل بھی گذر گیا تو پرسوں۔ چنگاری کے اُڑ کر گرنے، سلگنے، بھڑک اُٹھنے اور پھر راکھ کا ڈھیر بن جانے کے جہاں اتنے سارے سامان موجود ہوں وہاں کون کسی کا ہاتھ پکڑے گا، کون کسی مسکراہٹ کو قتل کا پیغام بننے سے روک سکے گا۔

رات کے گیارہ بجے تک جاگنے والی سڑک صبح چھ بجے بھی اونگھ رہی تھی، چینی اور شیشے کے برتنوں کے جلے، ادھ جلے ٹکڑوں کے ڈھیر، لٹی ہوئی دو کانوں، راکھ ہو جانے والی لکڑی کی بڑی ٹالوں کے درمیان۔

چائے کا مگ ایک چھناکے کے ساتھ فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔

’’ارے خاتون۔۔۔‘‘ ایک بھاری لیکن نسوانی آواز ابھری۔ ’’کیا غضب کرتی ہے روزانہ ایک برتن توڑ دیتی ہے، ابھی پچھلے ہفتہ ہی ایک پرچ توڑی تھی۔‘‘

خاتون نے جو نیم پاگل ہے، آئیں بائیں شائیں کی۔ کچھ سمجھ میں آیا، کچھ نہیں لیکن چہرے پر خجالت کی جھلملاتی چلمن، الفاظ کے آدھے، چوتھائی یا اس سے بھی کم اُگلے ہوئے اور اس سے بھی کم سمجھے ہوئے معنی نے مل جل کر افسوس، ندامت، شرمندگی کا ایک مجموعی تاثر پیدا کر

دیا تھا۔ لیکن یہاں تو افسوس کا ایک ٹوٹا پھوٹا، لولا لنگڑا لفظ بھی نہیں، چہرہ پر شرمندگی کا ایک تاثر بھی نہیں، آنکھوں میں آنسو تو دور کی بات، ندامت کی ایک لکیر بھی نہیں۔۔۔۔ ہاں کچھ لوگ، یا کچھ لوگوں کا گروہ ضرور ہے جو سوچتے ایک طرح ہیں، نہ ہنستے ایک طرح ہیں، نہ روتے ایک طرح ہیں، دو ہاتھ ہیں، دو آنکھیں اور دو ٹانگیں ہیں۔ سانس لینے کے دو نتھنے ہیں، پیار کرنے کے لیے دو ہونٹ ہیں، جو چلتے پھرتے باتیں کرتے، چراغاں کرتے، سارے شہر کو روشنیوں کا شہر بنا دیتے ہیں اور پھر اس روشنی سے اپنے دلوں کو تاریک کر لیتے ہیں۔ ایک نظر نہ آنے والی لکیر کے دونوں طرف انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے، ایک طرف ہنسی کے فوارے چھوٹتے ہیں تو دوسری طرف آنسوؤں کے دریا بہہ جاتے ہیں، ایک طرف کوئی واقعہ غم و اندوہ کی ایک ٹھنڈی لہر دوڑا جاتا ہے تو دوسری طرف خوشی کی ایک لہر دل و دماغ کو چھو جاتی ہے، لیکن اس لکیر ہی کی طرح یہ جم غفیر، انسانوں کا یہ ہجوم ہے کہاں؟ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔

۔۔۔ تو اس سے کیا ہوا؟ آنکھوں کو دماغ نے جھٹلایا۔ ایک مکان چھوڑ کر دوسرے مکان میں جو رہتا ہے وہ میں ہوں۔ اس سے پانچ مکان پہلے اور تین مکان بعد جو رہتا ہے وہ بھی میں ہوں۔ وہ سارا محلہ میں ہوں، وہ ساری گلی میں ہوں اور فلاں مکان، فلاں گلی، فلاں سڑک، فلاں محلہ، فلاں دوکان، میں نہیں بلکہ تم ہو۔ تم بھی نہیں غیر ہو، غیر بھی نہیں دشمن ہو، میرے دشمن، ہم سب کے دشمن۔

ٹوٹے برتنوں کے اس ڈھیر سے ایک ٹکڑا کلبلایا، اٹھا، دوسرے کونے سے دوسرا ٹکڑا، ایک طرف سے کنڈا، ایک جانب سے پیندا اور ذرا سی دیر میں ایک نہایت خوبصورت پیالی اور طشتری آنکھوں کے سامنے تھی۔

پھر اس سڑک سے آملنے والی، ایک پتلی سڑک کے چھوٹے لیکن خوبصورت سے مکان سے جو پاس کے دوسرے مکانوں کے شعلوں کی زد میں آکر زمین بوس ہو چکا تھا، جلی ادھ جلی سیاہ اینٹوں، خاکستر کپڑوں اور دوسرے سامان کے ملبے کے اندر سے ایک ٹبک سی میز

اور دو کرسیاں جن پر لپکتے شعلوں کا جیسے کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا، اسی تباہ و برباد مکان کے ایک ایسے کمرہ میں جس تک آگ کی ایک بھی لپٹ نہ پہنچی تھی، خود بخود بڑے سلیقہ سے رکھ دی گئیں۔ کمرے کی سجاوٹ مکینوں کی خوش ذوقی کی گواہی دے رہی تھی۔ ہلکے سبز رنگ کے پردے جن پر نازک نازک سرخ پھول چھپے ہوئے تھے، دروازے پر ٹنگے تھے۔ ایک جدید پینٹنگ بائیں دیوار پر ٹنگی تھی، ایک چھوٹی میز پر ریڈیو رکھا ہوا تھا، الماری میں کرشن، بیدی، منٹو کے افسانوی مجموعے، کچھ ادبی جریدے، بعض رسائل کے ضخیم نمبر اور انگریزی کی چند کتابیں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔

یکایک دونوں دروازوں کے پردوں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ ایک کی لہریں تیز تھیں، دوسرے کی مدھم، ایک کے پیچھے سے ایک بے چین، مضطرب، لیکن نہایت خوش سلیقگی سے بادامی رنگ کے سوٹ اور دھاری دار ٹائی میں ملبوس ایک نوجوان تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ دوسرے دروازہ کے پردوں کے پیچھے سے ساڑی، گہری سرخ لپ اسٹک، ناک میں چمکتی ہوئی چھوٹی سی کیل اور کان کی لوؤں میں دھیرے دھیرے ہلتے ہوئے آویزوں کی بیرونی شناخت کے درمیان جو ہیولا ابھرا اس کی آنکھوں نے چوری چوری میز اور سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے نوجوان کا جائزہ لیا، لیکن جیسے ہی نظریں ٹکرائیں، اس کی آنکھیں گویا زمین میں گڑ گئیں اور پھر وہ دوسری طرف کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

چار روز قبل پُل پر جلی بجھی لکڑی کی ٹال کی حرارت نے چائے بنائی، خلوص کے ان دیکھے ہاتھوں نے اسے پہلے کیتلی اور پھر ان پیالیوں میں انڈیلا جو محبت کی چاشنی سے بے داغ جُڑ گئی تھی۔ دو آنکھیں میز کی ایک جانب سے اُٹھیں، دو دوسری جانب سے، ایک طرف اشتیاق کی شدت اور اس کا اظہار تھا تو دوسری طرف اشتیاق کے باوجود خاموشی۔ پھر تقریباً ایک ساتھ لبوں کو چھونے کے بعد جب پیالیاں طشتریوں میں واپس رکھی جانے لگیں تو ان کے کونے ٹکرائے اور اس معمولی سے ٹکراؤ سے دونوں پیالیاں پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔ طشتریاں رکھے ہی رکھے اپنے پرانے زخموں کو یاد کر کے چور چور ہو گئیں۔ کرسیوں اور میز کو

نظر نہ آنے والے ہاتھوں نے پھر اسی جلے ہوئے مکان کے ملبے میں لا پٹکا، دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے بھک سے جل گئے، دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر کا رنگ و روغن پگھل کر ٹپ ٹپ گرنے لگا، فریم جل کر کوئلہ ہوگیا، رسالے اور کتابیں، ریڈیو، ریڈیو پر رکھا ہوا گلدان، گلدان پر سجے ہوئے گلاب کے پھول، پہلے سیاہی مائل ہوئے، پھر سیاہ، پھر بے رنگ ہو گئے۔ بادامی رنگ کے سوٹ، دھاری دار ٹائی اور ہلکے سبز رنگ کی ساڑی کی جگہ معمولی پھٹے پرانے کپڑوں میں رحم کی بھیک مانگنے والی چار آنکھوں نے لے لی۔ چند گھنٹوں بلکہ چند لمحوں نے ان کی عمروں سے کم سے کم بیس بیس برس چھین لیے۔ ایک نسل جوان ہوگئی، ایک نسل بوڑھی ہوگئی، ایک نسل قبر کی گود میں سوگئی۔

سنسان سڑک، لٹی ہوئی دوکانیں، بکھرے ہوئے ٹوٹے پھوٹے شیشے کے برتن، ہزاروں من لکڑی جو کوئلہ بھئی نہ راکھ، فائر بریگیڈ، گشت لگاتی ہوئی پولیس کی ٹکڑیوں کے بوٹوں کی آواز۔۔۔ اپنی ہی سانس اور ہوا کی سرسراہٹ سے چونک پڑنے والے بہادر دل، مسکراہٹوں سے نفرتیں جگانے والے چہرے، نفرتوں کو مسکراہٹوں سے قبول کرنے والی مصلحتیں۔

ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ سامنے سڑک پر بہت سے لوگ ایک طرف سے دوڑتے ہوئے آئے اور جس کا جہاں سینگ سمایا گھس گیا۔ دوکانوں کے شٹر آن کی آن میں گرا دیے گئے، جو سواری جس طرف گئی لوٹ کر نہ آئی، سبزی ترکاری فروخت کرنے والے ٹھیلے تیزی سے دوڑتے چلے گئے، مکانوں کے دروازے، کھڑکیاں بند ہوگئیں اور چند ہی منٹوں میں سارے علاقے پر کرفیو کے سنّاٹے کے ایک بہت بدصورت، مہیب اور بڑے پرندے نے آکر اپنے پَر پھڑپھڑائے اور جہاں جہاں اس کے پروں کی ہوا پہنچی وہاں وہاں جو لوگ سڑکوں پر تھے، مکانوں میں گھس گئے۔ جو اپنے آنگنوں میں تھے کمروں میں چلے گئے، جو کمروں میں تھے بستروں میں دُبک گئے اور جو پلنگوں کے نیچے تھے، کونوں کھدروں اور بکسوں کے پیچھے، مئی جون کے مہینوں کے لیے پچھلے سال کی رکھی ہوئی خس کی ٹٹیوں کے پیچھے

دُبک گئے۔ ہر طرف سناٹا تھا، کوئی آواز نہ تھی، سانس بھی لوگ آہستہ آہستہ لے رہے تھے۔

پھر ایک جیپ آئی جس پر لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا، کچھ سپاہی پیچھے بیٹھے تھے، کندھوں سے بندوقیں لٹکائے ہوئے، شہر کے کسی بھاگ میں کوئی درگھٹنا نہیں ہوئی ہے، کرفیو لگنے میں ابھی تین گھنٹے باقی ہیں، آپ لوگ دوکانیں کھولیے، سودا سلف خریدیے، کوئی درگھٹنا نہیں ہوئی ہے۔''

لیکن کوئی دوکان نہیں کھلی۔ سودا سلف خریدنے کوئی گھر سے باہر نہیں نکلا۔

''ابو، ابو،'' میری بیٹی نے دروازہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا''گولی چلی ہے. بہت سے لوگ مارے گئے۔''

''کہاں۔'' میں ہنسا۔ اس کے ذہن سے ڈر دور کرنے کے لیے میں نے کہا۔''گولی تو کہیں نہیں چلی۔''

''نہیں ابو، آپ کو معلوم نہیں۔ رکشہ والا کہہ رہا تھا کہیں گولی چلی ہے۔''

''نہیں بیٹی، کہیں گولی نہیں چلی۔'' میں نے کہا۔

''نہیں ابو۔'' میری سات آٹھ سال کی بچی کو اپنی معلومات صحیح ہونے پر اصرار تھا۔

''وہ بڑے خراب ہیں۔''

''وہ کون۔۔۔؟'' میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ۔۔۔۔'' اس نے کندھے پر ٹنگا ہوا بستا اُتارتے ہوئے ان لوگوں کا مجموعی نام لیا جنھیں وہ اپنے سے الگ، دوسرا اور غیر سمجھتی تھی۔''وہی جنھوں نے اتنے بہت سے آدمیوں کو مار ڈالا۔ دوکانیں جلا دیں۔''

اگلے روز اخبار سے معلوم ہوا کہ کہیں گولی چلی تھی نہ جھگڑا ہوا تھا، ایک مرکھنے بیل نے کسی کو دوڑایا، وہ ''بچاؤ بچاؤ'' چلاتا ہوا بھاگا، پھر کچھ اور لوگ بھاگے، پھر سناٹے کا مہیب پرندہ آیا اور پر پھڑپھڑاتا رہا اور فضا میں اس کے پروں سے نکلنے والی ہوا پھیلتی رہی۔

اس مرکھنے بیل کی خبر تو اگلے روز اخباروں میں چھپ گئی لیکن اس درمیان جو دل حرکت

کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے رُک گئے۔ انھیں ہاتھ سے نکل جانے والے ان لمحوں میں حرکت کون دے گا اور اس آٹھ سالہ بچی کے اوپر سناٹے کے مہیب پرندے کے پروں سے نکلنے والی ہوا سے پیدا ہونے والے زہر اور زہر آلود سوالوں کا جواب کون دے گا؟

سوکھی گھاس، نئے نوٹوں کی طرح کڑکڑاتے نعرے جو سکۂ رائج الوقت بنے ہوئے ہیں، ہر چنگاری کو قبول کرنے اور بھڑکتے ہوئے شعلہ میں تبدیل کر دینے والا دماغ ـــ ہر دوسرا شخص یا چند اشخاص کا گروہ جو میں نہیں ہوں، یا ہم نہیں ہیں، سازشیں بُنتی ہوئی آنکھیں، مسکراہٹوں کو کدورتوں، نفرتوں، عداوتوں کے رنگ میں رنگ دینے والے ذہن سے جڑی ہوئی دو آنکھیں۔ ان میں سچ مچ کی چنگاری کے اُڑ کر گرنے، سلگنے، بھڑک اُٹھنے اور پھر راکھ کا ڈھیر بن جانے کے جہاں اتنے سارے سامان موجود ہوں، وہاں کون کسی کا ہاتھ پکڑے گا، کون کسی مسکراہٹ کو قتل کا پیغام بننے سے روک لے گا؟

■■

میں اور میں

میں اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری اُنگلی میں سونے کی انگوٹھی جس میں زمرد چمک رہا تھا، دوسرے ہاتھ کی انگلی سے گھما رہا تھا۔ میری پیشانی پسینہ سے بھیگ گئی تھی۔ میں جو صوفہ پر تقریباً نیم دراز تھا، نہایت آہستگی سے اُٹھا اور میں نے نہایت قیمتی لکڑی کے بنے ہوئے سنگار میز کے شیشے پر کپڑا ڈال دیا۔ اب سامنے شیشے میں میرا عکس نظر نہ آ رہا تھا لیکن میں اپنے اندر خود کو دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ خود کو دیکھ رہا تھا۔

اس کے پاس میرے لیے ایک پیغام تھا۔

بات چیت اس طرح شروع ہوئی۔

”میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔“

”جی فرمائیے، حاضر ہوں۔“

”شکریہ۔“ اس نے کہا اور اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر جس میں کپڑے کا ایک تھیلا لٹک رہا تھا، برآمدہ سے کمرے میں داخل ہو گیا (کپڑے کے اس تھیلے کو میں نے پہلے کہیں دیکھا تھا)۔ میں دروازہ پر ایک منٹ، نہیں آدھے منٹ تک حیرت اور غصہ کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ کھڑا اس کا منہ دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا اس کے سامنے والے صوفہ پر بیٹھ گیا۔ (وہ صوفہ پر پہلے ہی بیٹھ چکا تھا)

”میں آپ کا وقت تو برباد نہیں کر رہا ہوں۔“ اس نے زخم پر نمک چھڑکا۔ میں نے تکلف سے کام لیا۔

”جی نہیں۔“

”بات یہ ہے کہ مجھے ایک ایسے شخص نے بھیجا ہے جسے آپ جانتے نہیں۔“ (اب میری

اُلجھن اور بڑھنے لگی) اس نے گفتگو جاری رکھی۔ ''اس کا آپ کے لیے ایک پیغام بھی ہے۔ وہ پیغام میں ابھی آپ تک پہنچاؤں گا۔''

''میرے لیے پیغام؟''

''جی ہاں۔۔۔''

میں خاموش رہا، نو وارد کا منھ تکتا رہا۔

''میرے اس محسن کا نام کیا ہے؟'' اب مجھ سے خاموش نہ رہا گیا۔

''آپ ناموں میں یقین رکھتے ہیں۔''

میں سوال کر کے شرمندہ ہو گیا۔

اس نے کہا، ''اگر صوفہ کا نام میز ہوتا، ہر شخص اسے اسی نام سے پکارتا تو کیا صوفہ بدل جاتا۔''

''پھر بھی۔'' میں نے بحث کرنی چاہی۔

''یعنی کچھ بدل جاتا۔''

میں لاجواب ہو گیا۔

اب اس نے تھیلا جو وہ ہاتھ میں لیے ہوئے تھا، میز پر رکھ دیا اور کہا۔

''میری اس سے ملاقات عجیب حالات میں ہوئی تھی۔''

''جی ہاں۔'' میں نے سپر ڈال دی۔

''آپ کو وہ حالات معلوم ہیں۔''

''جی نہیں۔''

میں ایک بار پھر لاجواب ہو گیا۔

اب وہ پورے کمرے کے ماحول پر چھا چکا تھا اور میری حیثیت اس طویل و عریض کمرے میں محض ایک جھنگے کی ہو گئی تھی۔ میں اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوں اور کیا

نہیں ، اس کی اس وقت خود میرے لیے کوئی اہمیت نہ رہ گئی تھی ، اس عالیشان مکان کا میں ہی مالک تھا ، لیکن مالکانہ حقوق کو اس طرح بے وقعت اور ذلیل ہوتے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اب ایک نئی طاقت میرے اندر اُبھری ، میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی ، یہ وہی کمرہ اور وہی مکان تھا جس کے سیاہ وسفید کا میں مالک تھا۔ تھوڑی دیر قبل تک اس مکان کے ایک ایک چپہ پر میرا حکم چلتا تھا۔۔۔۔ مجھ میں اپنے حقوق پر اصرار کرنے کی ایک اور لہر آئی۔ کیا میں ملازم کو آواز دوں اور اس سے کہوں کہ اس شخص کو دھکے دے کر باہر نکال دے۔ لیکن ایسا کر کے کیا میں یہ تسلیم نہ کروں گا کہ میں اس مکان ، اس کمرہ میں بھی کسی کی مدد کا محتاج ہوں؟

وہ اب بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔

اب اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی ، سگریٹ جلائی ، ایک کش لیا ، ماچس کی تیلی اور چارمینار کا کھلا پیکٹ میز پر رکھ دیا۔ مجھے پیکٹ میں سگرٹوں کو کاغذ میں لپٹا ہوا دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس نے ایک کش لیا اور کہا۔

''آپ سگریٹ پیتے ہیں؟''

میرا جی چاہا کہ اُٹھ کر اس کے منھ پر دو بھرپور تھپڑ رسید کر کے باہر کا راستہ دکھا دوں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ شاید اس سے پہلے کبھی مجھے اس سے زیادہ غصہ نہیں آیا تھا ، اور نہ آئندہ ہی کبھی آئے گا ، لیکن میرا یہ خیال غلط تھا۔

''اس نے آپ کا نام بھی نہیں بتایا تھا ،'' اس نے کہا۔

یہ سن کر میرے غصہ کا پارا اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔

اب اسے ایک لمحے کو بھی برداشت کرنا میرے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس سے کہوں۔ ''حضرت ! اگر آپ فوراً یہاں سے تشریف نہ لے گئے تو مجھے دوسرے ذرائع

استعمال کرنے پڑیں گے۔'' لیکن وہ بہرحال میرا مہمان تھا۔ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ مجھ ایسے ''شریف'' آدمی کو کسی طرح زیب نہ دیتا تھا۔ میں اس وقت دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک کہتا تھا اسے فوراً کمرے سے باہر کر دو۔ دوسرا کہتا، یہ تو کوئی شرافت کی بات نہ ہوگی۔ میں نے اپنا غصہ کم کرنے کے لیے اس کی صورت، ہاتھ پیر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور مجوب سی تھیں، جس قدر جرأت اور بے باکی کا وہ بات چیت اور برتاؤ میں مظاہرہ کر رہا تھا اس کی کوئی علامت اس کی آنکھوں سے ظاہر نہ ہوتی تھی۔ لیکن ان دونوں آنکھوں پر گھنے، سیاہ بالوں کی جھجے جن میں ایک آدھ سفید بال چمک رہا تھا، اور پیشانی پر گہری لکیریں کرختگی اور مزاج کی درشتی کا اظہار کر رہی تھیں، سر کے بال بھورے اور چھوٹے چھوٹے تھے، ہاتھ موٹے لیکن بے حد سخت تھے، بائیں ہاتھ کی بیچ والی انگلی میں وہ چاندی کی ایک انگوٹھی پہنے تھا جس میں ایک بڑا سبز پتھر لگا تھا۔ پتھر معمولی قیمت کا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے جب اس کی آنکھوں میں گھور کر دیکھا تو اُس نے آنکھیں جھکا لیں اور دوسرے ہاتھ سے انگوٹھی کو انگلی میں چکر دینے لگا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ کی دو بوندیں چمک اُٹھیں جن کو اس نے انگلی سے پونچھ دیا۔ میں نے چھت میں ٹنگے پنکھے کی طرف دیکھا لیکن گرد و غبار سے بچانے کے لیے ان پر کپڑا سلا ہوا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا، اس کے کپڑے معمولی اور ایک آدھ جگہ سے پھٹے ہوئے۔ جوتا خاصا پرانا اور گرد سے اٹا ہوا تھا، جسے برش تو کیا میلے کپڑے سے بھی مہینوں سے پونچھا نہ گیا تھا۔

اب بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔

میں نے کہا ''میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ فرمائیے، میں حاضر ہوں۔''

اپنے اس جملے کا تاثر معلوم کرنے کے لیے میں نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا، جو بالکل سپاٹ تھا، پہلے ہی کی طرح۔

''جی شکریہ۔'' اس نے کہا۔

''تو فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''آپ — آپ — ''اس کے ہونٹ کانپے — ''آپ کو معلوم ہے کہ میرے پاس آپ کے نام ایک پیغام ہے۔''

''پیغام!''

''پیغام!!''

''پیغام!!!''

میری ساری ہمدردی یکدم غائب ہو گئی۔ آخر یہ شخص چاہتا کیا ہے۔ غصہ کا پارا جسے میں نے بڑی محنت اور تحمل سے نیچے کیا تھا، ایک دم پھر چڑھ ہو گیا۔

''دیکھیے مسٹر، مجھے اور بھی کام کرنے ہیں۔ میں آپ کی پہیلیوں میں اپنا سارا وقت ضائع نہیں کر سکتا۔'' میں نے اپنی گھڑی دیکھی، سوا گیارہ بجا تھا۔

''بگڑیے نہیں۔ میرے پاس واقعی آپ کے اور صرف آپ کے لیے ایک پیغام ہے۔ اگرچہ وہ شخص اب اس دنیا میں نہیں ہے، لیکن اس کا پیغام اب تک موجود ہے، اور میں اسے اپنے سینے سے لگائے مارا مارا پھر رہا ہوں، آپ کی تلاش میں۔''

''کیا وہ میرا محسن اب اس دنیا میں نہیں ہے؟''

میری دلچسپی بڑھی۔

''جی نہیں، اسے مرے ہوئے تو بیس سال ہو گئے۔''

''اور آپ نے اس کا پیغام پہنچانے میں بیس سال لگا دیے۔''

''جی ہاں میں اُسی وقت سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔''

''لیکن آپ تو کہتے ہیں کہ میں اُس کو جانتا بھی نہیں۔''

''جی ہاں۔''

''اور وہ مجھے...''

''وہ بھی آپ کو نہیں جانتا تھا، یا شاید جانتا رہا ہو۔''

اس نے اپنی آنکھیں پھر جھکا لیں۔ اپنی پیشانی سے پسینہ کے قطرے دوبارہ پونچھے۔

’’یہ کیسا پیغام ہے کہ جس کا بھیجنے والا اور جسے بھیجا جا رہا ہے، دونوں ہی ایک دوسرے سے ناواقف ہیں اور آپ کون ہیں کہ بیس سال سے ان دونوں سروں کو ملانے کے لیے مارے مارے پھر رہے ہیں۔‘‘

’’جی میں سچ کہتا ہوں یہ پیغام صرف آپ کے لیے ہے، آپ واحد آدمی ہیں، جس نے اتنی دیر میری باتیں سنی ہیں ورنہ میں جہاں بھی گیا، جس دروازہ کو بھی میں نے کھٹکھٹایا، وہاں چند ہی جملے سن کر مجھے نکال دیا گیا۔۔۔۔ ایک شخص نے تو مجھے مارا بھی، ایک صاحب نے اپنے السیشین کتے کو میری طرف ’’شو‘‘ کر کے دوڑا دیا۔۔۔۔ یہ دیکھیے، اُس نے پتلون کی مہری پنڈلیوں تک اُڑس لی (زخم کا ایک بھرپور نشان صاف نظر آ رہا تھا) ایک شخص نے مجھے پولیس کے حوالہ کر دیا لیکن پولیس نے مجھے چھوڑ دیا۔

اس نے اپنی بھوؤں کا چھجا اُٹھا کر میری طرف دیکھا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں خود اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوں۔

’’میں نے پولیس سے کہا کہ میں قاتل ہوں، مجھے پھانسی دے دو تو سپاہی مجھے حوالات سے باہر نکال کر کوتوالی کے سامنے صحن میں داروغہ جی کے پاس لے گئے، میری بات سن کر سب ہنستے رہے، داروغہ جی نے مجھ سے سر دبوایا۔ میں نے خوب دل لگا کر اُن کا سر دبایا تو وہ خوش ہو گئے اور بولے، ’’کیا مانگتا ہے؟‘‘ اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر سپاہیوں سے بولے۔ ’’اسے جانے دو، پاگل معلوم ہوتا ہے۔‘‘

’’میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا، میں پاگل نہیں، قاتل ہوں، مجھے پھانسی دے دیجیے۔ انھوں نے زبردست قہقہہ لگایا، میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ میں سچ کہتا ہوں میں قاتل ہوں، مجھے پھانسی دے دیجیے، وہ پھر زور سے ہنسے۔۔۔۔ پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولے۔

’’اچھا بول، تو نے کس کو قتل کیا ہے؟‘‘

’’یہ میں نہیں جانتا۔۔۔۔ اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔۔۔۔ لیکن اس کی شکل مجھ سے

بے حد ملتی تھی۔"

"وہ سب ایک بار پھر زور سے ہنسے۔"

"کسی نے تجھے قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا؟" انھوں نے مذاقاً مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں ایک دو نے نہیں سینکڑوں نے۔۔۔۔"

"تو ان میں سے کسی گواہ کو لے آ۔ اب وہ مذاق پر اُتر آئے تھے۔"

"میں ان میں سے ایک کو بھی نہیں جانتا۔ ان میں سے صرف دو طرح کے لوگ تھے، قاتل یا مقتول۔ ان میں سے آدھے مر گئے۔ انھیں اسی وقت قتل کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک وہ شخص بھی تھا جس کو میں نے قتل کیا تھا۔ مجھے اس کی شکل و صورت یاد ہے۔ جب میں نے اس کا گلا گھونٹا تو اس کی آنکھوں میں مایوسی کی جو کیفیت پیدا ہوئی تھی، وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ لیکن مجھے اپنے ان ساتھیوں کی صورتیں یاد نہیں جو۔۔۔۔ میں خود اس کی طرف سے گواہی دوں گا نام، مجھے نہیں معلوم تو کیا ہوا۔"

"اب سب ایک بار زور سے ہنسے۔"

"میں نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔۔۔۔ "تھانے دار صاحب! میرے حال پر رحم کیجیے مجھے پھانسی دے دیجیے۔"

"ابے جا، سر دبا کر جتنا درد دور کیا تھا، اس سے زیادہ دماغ چاٹے جا رہا ہے۔" انھوں نے کہا۔

"میں گڑگڑاتا رہا لیکن سپاہیوں نے دھکے دے کر مجھے تھانہ سے باہر کر دیا۔"

اب وہ سچ مچ رو رہا تھا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں، وہ اپنے دونوں ہاتھ مل رہا تھا۔

"میں سچ کہتا ہوں، میں اسے جانتا نہ تھا، لیکن وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا تھا۔ وہ اب بھی میرے ساتھ ہے۔ وہ میرا ساتھ نہیں چھوڑتا۔۔۔۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا تھا لیکن اسے مار ڈالا تھا، میں نے ان ہاتھوں سے اس کی جان لی تھی۔" اس نے اپنے ہاتھ بلند کیے اور پھر صوفہ پر رکھ دیے۔

’’اس نے مجھ سے کہا تھا میں تو مر جاؤں گا لیکن تمھیں مانگے موت بھی نہ ملے گی۔ تمھیں کوئی ایسا بھی نہ ملے گا، جسے تم بتا سکو کہ تم نے کیسے مار ڈالا ہے۔۔۔۔۔ میں آپ کا بہت وقت لے رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں آپ بہت مصروف آدمی ہیں، میں مصروف کبھی نہیں تھا، گھنٹوں دوسروں کے دکھڑے سنا کرتا تھا۔ پھر میں نے اسے مار ڈالا اور اب کسی کو میری بات سننے کا وقت بھی نہیں۔‘‘

میں حیرت اور رحم کے ملے جلے جذبات سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ دیکھے جا رہا تھا۔ اب اُس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کی گردن ایک طرف لڑھک گئی تھی۔

اس نے آنسو پونچھنے کے لیے ہاتھ اُٹھانا چاہا، لیکن صرف اس کی انگلیوں میں جنبش ہوئی اور اُس نے اپنا سر صوفہ پر ٹکا لیا، ایک لفظ بھی اس کے منھ سے نہ نکلا۔۔۔۔۔ میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، وہ برف کی طرح سرد تھا۔۔۔۔۔ میں بھاگا بھاگا اندر گیا، گلاس میں پانی لے کر آیا اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر گلاس منھ سے لگا دیا لیکن اس کے ہونٹ نہ ہلے، میں نے اس کا بایاں ہاتھ صوفہ پر سے اُٹھا کر اپنے دل کے قریب کیا، دوسرے ہاتھ میں گلاس کا پانی چھلکا تو اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔۔۔۔۔ اور دھڑ سے صوفہ پر گر گیا۔ پھر اس کی گردن بائیں طرف جھکی اور اُس کا سارا جسم صوفہ پر ڈھیر ہو گیا۔۔۔۔۔ میں نے ملازم کو بلا کر اُسے تخت پر لٹا دیا، اس کی ٹانگیں اور ہاتھ سیدھے کر دیے اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے آخری قطرے پونچھ ڈالے۔

میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں سونے کی انگوٹھی جس میں زمرد چمک رہا تھا، دوسرے ہاتھ کی انگلی سے گھما رہا تھا، میری پیشانی پسینہ سے بھیگ گئی تھی، میں جو صوفہ پر تقریباً نیم دراز تھا، نہایت آہستگی سے اُٹھا اور میں نے نہایت قیمتی لکڑی کے بنے ہوئے سنگار میز کے شیشے پر کپڑا ڈال دیا۔ اب سامنے شیشے میں میرا عکس نظر نہ آ رہا تھا، لیکن میں اپنے اندر خود کو دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔ خود کو دیکھ رہا تھا۔

■ ■

مدد کا خواستگار

میرے گھر کے سامنے مسجد ہے، ذرا ہٹ کر کوئلہ کی ایک دوکان، داہنی ہاتھ والی گلی میں طوائفوں کے کوٹھے اور بائیں طرف میرے مالک مکان کے موٹر ڈرائیور کا کمرہ۔

اب میں آپ کو ان لوگوں سے متعارف کراتا ہوں۔ آپ ہی بتلائیے کہ یہ کہانی یا مضمون کہاں سے شروع کیا جائے۔ اچھا چلیے سامنے والی گلی سے ہی سہی جہاں طوائفوں نے کوٹھوں کو رونق بخش رکھی ہے۔ اسے کنگھی والی گلی کہتے ہیں، یہاں نیچے کنگھیاں بنتی اور اوپر ٹوٹتی ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اوپر رہنے والیوں کو اس بات کا علم تو ہوتا نہیں کہ کون گاہک کب آجائے گا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا، موت اور گاہک کا کوئی وقت نہیں، اس لیے دن رات سوتے، جاگتے، ہر وقت ان کو بنا سنوارا رہنا پڑتا ہے، اور ظاہر ہے اس مشاطگی میں کنگھی کا ہاتھ کچھ کم نہیں ہوتا۔ پہلے والے کوٹھے پر ایک بورڈ لگا ہے "مس راج رانی ڈانسر" جہاں سے رات کے دس بجے تک ہارمونیم، طبلہ اور گانے کی آواز آتی رہتی ہے۔ اس کے بعد خاموشی چھا جاتی ہے، دن کو اسی سڑک پر آپ کو یہی راج رانی سامنے والے چبوترے پر پان بیڑی کی دوکان رکھنے والے سدو کے پاس بیٹھی، پان چبا چبا کر بات کرتی، کنگھی والوں کے پاس بیٹھی، یا ان کے پاس تاش کھیلتی ہوئی ملے گی۔ ناک نقشہ سبک، قد درمیانہ، نازک بدن، رنگ گورا، آج بھی وہ حسین ہے، لیکن شاید وہ خود بھی اس راز سے واقف نہیں۔ آپ ادھر سے گزر جائیے مجال ہے، جو وہ ایک بار بھی مسکرائے۔ میرا مطلب اس مسکراہٹ سے ہے جس میں دعوت ہوتی ہے، بلاوا ہوتا ہے، ویسے مسکرائے گی، قہقہہ بھی لگائے گی، اور آپ اگر ادھر سگریٹ پینے کے لیے

گزریں اور سدو دوکان پر موجود نہ ہو تو ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر آپ کے ہاتھ میں دے بھی دے گی اور پیسے چھوٹی سی صندوقچی میں رکھ دے گی۔ اس محلّہ کا کوئی بھی شخص اس چھوٹی سی دوکان سے پان سگریٹ لے سکتا ہے، سدو ہو چاہے نہ ہو، پیسے خود اپنے ہاتھ سے صندوقچی میں ڈال سکتا ہے اور باقی پیسے نکال سکتا ہے۔ ہاں تو سگریٹ دیتے ہوئے اس کے ہاتھ آپ کے ہاتھ سے مس ہو جائیں گے تو اس کے چہرہ پر ایک لمحہ کے لیے بھی مسکراہٹ نہیں پھیلے گی. شاید اسے اس بات کا احساس تک نہ ہوگا۔ یہ بات دوسری ہے کہ خود آپ دو منٹ بعد سگریٹ لینے پھر سے پہنچ جائیں اور اسے دوکان پر نہ پا کر خالی ہاتھ ہی چکّر لگا کر لوٹ آئیں۔

اگر آپ اس سے بات کریں تو وہ نہایت بے تعلّقی سے جواب دے گی، جیسے اسے آپ کی ذات سے کوئی دلچسپی نہ ہو، لیکن اس کی آواز میں ذرا بھی تصنّع نہ ہوگا، بناوٹ کا انداز تک نہ ہوگا۔ آپ محسوس کریں گے کہ آپ شائد اپنے گھر میں بیٹھے بات چیت کر رہے ہیں، اپنی بہن سے، ماں سے، یا کسی اور عزیزہ سے۔

اوپر کوٹھے پر باہر کے کمرے میں چار کرسیاں بچھی ہیں۔ یہ ان لوگوں کے لیے ہیں جو رات گئے وقت گزاری کے لیے یہاں آتے ہیں ـــــ اندر کمرہ میں نرگس، پنڈت نہرو، سبھاش چندر بوس، ثریا، شیلا رمانی اور چندر شیکھر آزاد کے فوٹو ایک قطار میں لگے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ رات کو جو شخص بھی یہاں آتا ہے عام طور سے خالی جیب واپس جاتا ہے۔ گھر جانے کے کرائے بھر کے پیسے بھی اس کے پاس باقی نہیں بچتے، مسکرانے کے پیسے، پان سگریٹ کے پیسے، جھک جھک کر سلام کرنے کے پیسے، دودھ کے پیسے اور خدا جانے کس کس چیز کے پیسے ـــــ اس گھر میں کُل ملا کر پانچ افراد رہتے ہیں، ان میں سے عورت صرف یہی ایک ہے باقی سب مرد۔ یہ چاروں دن بھر بیٹھے تاش کھیلا کرتے ہیں یا پھر شام کو قمیص پتلون یا کبھی کبھی قمیص شلوار پہن، گردن میں سرخ رومال لپیٹ کر سیر و تفریح کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان چاروں مردوں کا اور کوئی کام نہیں۔

دوسرا کوٹھا بھی آباد ہے۔ اس پر بھی ایک لڑکی رہتی ہے۔ وہ بھی شاید یہی کام کرتی ہے۔ بار بار اس سڑک سے گزرنے کے باوجود میں اس کی صرف ایک جھلک دیکھ سکا ہوں۔

اس کے کوٹھے پر کوئی بورڈ آویزاں نہیں ہے۔ اس کا نام بھی مجھے نہیں معلوم۔ خدوخال سے بھی زیادہ واقف نہیں، ہاں ایک جھلک دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہوا تھا کہ اس کی عمر کم ہے۔ ابھی چند دن پہلے ہی آئی ہے۔ دن کو کوٹھے سے اُتر کے کنگھی والوں کے ساتھ بیٹھ کے گپ بازی نہیں کرتی، تاش نہیں کھیلتی۔ مجھے اس کے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں معلوم۔

اس گلی میں ایک کوٹھا اور بھی ہے۔ زینہ پر سیدھے چڑھ کر بائیں جانب مڑنے پر ایک کمرہ ملتا ہے، اس کے بعد ایک چھوٹا سا کمرہ۔ یہ کمرہ ان لوگوں کے لیے وقف ہے جو گانا سننے کے بعد بھی اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ اس کوٹھے کو رونق بخشنے والی عورت کا نام شیام کماری ہے۔ عمر یہی کوئی بیس پچیس کے درمیان، دانت قدرے بڑے لیکن ایسے بڑے بھی نہیں کہ منھ سے باہر نکل آئیں۔ ہاں ہنستی ہو تو ایک فلم ایکٹریس کے دانتوں کا خیال ضرور آتا ہے۔ اس کا رنگ بھی صاف ہے اور عشوہ و ادا میں بھی ”پھول رانی“ کے مقابلہ میں زیادہ ماہر اور ہوشیار۔ دن کو اور اس سڑک سے گزرنے والے اکثر و بیشتر رات کو اس کے یہاں آجانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اکثر شام ہوتے ہی ایک رکشہ دروازہ پر آ کر رُکتا ہے اور پھر اسی گھر کا کوئی نوجوان، اچھے خاصے کپڑوں میں ملبوس، اور وہ خود بھی برقعہ اوڑھ کر اور کبھی یونہی اس میں بیٹھ جاتی ہے۔ دونوں امین آباد یا حضرت گنج میں اُتر جاتے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے سڑکوں پر گھوما کرتے ہیں، پھر وہ کسی نوجوان کے ساتھ کبھی رات گئے واپس آتی ہے اور کبھی اگلی صبح ـــــ کبھی شریف گھر کی بہو بیٹی بن کر۔ ہزار حیلے تراش کر، گھر سے سنیما کی اجازت لے کر آنے کا بہانہ کر کے کسی نوجوان سے عشق لڑاتی ہے، کبھی اس کے گھر چلی جاتی ہے اور کبھی عاشق خود اس کے گھر ہی چلا آتا ہے۔ اس کے گھر پر بھی کوئی بورڈ نہیں لگا ہے، لیکن قبل اس کے کہ میں آس پاس کے دوسرے لوگوں کا ذکر کروں، اس کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ سن لیجیے۔ پرسوں رات کی بات ہے کہ اس گلی سے مار پیٹ اور کسی عورت کے رونے دھونے کی آوازیں سنائی دیں۔ اگلے روز پتہ چلا کہ رونے والی اُس کے علاوہ اور کوئی نہ تھی۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ ایک نوجوان جسے گھر سے دَوا لانے کے پیسے دیے گئے تھے، اس کے چکر میں پھنس گیا تھا، واپس جاتے وقت اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پھوٹی کوڑی نہ تھی۔

جوانی کا بھوت، سر سے اُتر چکا تھا، بیمار ماں کا خیال آیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔۔۔۔۔ اس نے تکیہ کے نیچے سے روپے نکالے اور اُس کے حوالے کر دیے۔۔۔۔۔ بعد میں جب اس عورت کے مالکوں نے روپے طلب کیے تو پتہ چلا کہ نوجوان یونہی چلا گیا تھا۔ شامت اس بیچاری کی آئی اور نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی۔

جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں، میرے گھر کے بالکل سامنے کوئلہ کی ایک ٹال ہے۔ پاس ہی اس ٹال کے مالک کا گھر ہے، مالک کا نام عبد الکریم ہے۔ ابھی دو سال ادھر تک ایک کارخانہ میں ملازمت کرتے تھے، ان کا کام صبح اُٹھ کر ”سیاست“ اخبار پڑھنا، دوکان پر بیٹھنا، نماز پڑھنا اور کبھی کبھی ہندوستان کی سیاحت پر بحث کرنا ہے۔ ننھے، منّے اور بنّے (اصلی نام مجھے نہیں معلوم) ان کے تین چھوٹے بچوں کے نام ہیں۔ یہ تینوں دن بھر پتنگ اُڑاتے ہیں یا گولیاں کھیلتے ہیں، بیکار گھوما کرتے ہیں اور بہت زیادہ کچھ کرتے ہیں تو جمعہ کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا ڈاک خانہ میں ملازم ہے، اس سے چھوٹا صبح سویرے لکڑی کے ایک ہینگر پر معمولی سی رنگ برنگی چوٹیاں، بالوں کے فیتے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں لے کر نکل جاتا ہے اور شام کو واپس آتا ہے۔ پانچ لڑکیوں میں سے دو جوان ہیں، ایک جوانی اور بچپن کے درمیان اور دو بچیاں۔۔۔۔۔ یہ دونوں بچیاں مکان کے باہر والے میدان میں محلہ کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتی ہیں، درمیانی عمر والی لڑکی کانا پردہ کرتی ہے اور باقی دونوں لڑکیاں اس طرح کا پردہ کرتی ہیں کہ آپ اُنہیں کسی وقت بھی دروازہ یا چھت پر کھڑا دیکھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ چائے ہوٹل سے آتی ہے، کپڑے محلہ کا درزی بشیر سیتا ہے، کھانا خدا جانے کیسے اور کیسا گھر میں پک جاتا ہے۔۔۔۔۔ کریم صاحب دنیا سے تقریباً بے نیاز ہیں، چھوٹے بڑے سب سے سلام میں پہل کرنے کی سعادت کا شرف انھی کو حاصل ہوتا ہے۔ ان کے گھر کے پاس ہی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر رہتے ہیں جن سے ان کی سخت لڑائی ہے اور مقابلہ صرف اس بات کا ہے کہ مکان کس کا اونچا رہتا ہے۔ پروفیسر کا مکان ایک منزلہ سے دو منزلہ ہوا تو چھ مہینہ کے اندر اندر کریم صاحب کا مکان بھی دو منزلہ بن گیا اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ پروفیسر صاحب کے مکان سے چار انچ اونچا۔

میرے مکان کے بائیں ہاتھ پر ایک چھوٹا سا مکان ہے، صاحب خانہ حضرت گنج کی کسی دوکان میں کام کرتے ہیں، تنخواہ معمولی ہے، محلّہ کی مسجد کی سیاست اور کریم صاحب اور پروفیسر صاحب کے مکان کی اونچائی کے مقابلہ سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں ہے، شریف قسم کے آدمی ہیں، اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، کسی کے پھٹے میں پیر ڈالنے کا انھیں شوق نہیں۔ بڑا لڑکا انٹرمیڈیٹ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور قابل ذکر بات مجھے نہیں معلوم۔

مسجد اس محلہ کی تمام تمدنی اور مذہبی سرگرمیوں کی مرکز ہے۔ محلّے کے رئیس اعظم یوسف حسن سے لے کر ان کا ڈرائیور رسید تک ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر محمود و ایاز کے یکجا ہونے کا عملی نقشہ پیش کرتے ہیں۔ فضلو اس مسجد کے پیش امام ہیں، لیکن ان کی حیثیت سرکاری نہیں غیر سرکاری ہے۔ سرکاری موذن وہ ہوتا ہے جس کے اخراجات محلّے والے برداشت کرتے ہیں، اور وہ خود مسجد کے حجرہ میں پڑا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف فضلو صاحب ایک شاندار ماضی کے مالک ہیں، اور ان کا مستقبل بھی شاندار ہے۔ کل کا دنیا کے جھنجھٹوں میں پھنسا ہوا انسان آج اس سے منھ موڑ چکا ہے۔ ابھی دو سال ادھر ہی کی تو بات ہے جب وہ داڑھی منڈائے انگریزی بال کٹائے، سر پر ہیٹ لگائے، کوٹ پتلون ڈالے ٹھاٹھ سے گھوما کرتے تھے۔ ان دنوں ایک قومی لیڈر کے مجسمے بنانا ان کا پیشہ تھا۔ پھر جوں جوں اس لیڈر کی یاد لوگوں کے دلوں سے محو ہوتی گئی، ان کے مجسمے بکنا بھی بند ہو گئے۔۔۔۔۔ پھر ذاتی دشمنی یا مصلحت کے پیش نظر نہیں بلکہ خالص وطن پرستی کے جذبے کے تحت انھوں نے ان لوگوں کے نام پولیس میں لکھانا شروع کر دیے جو اپنی جائیدادیں چھوڑ کر پاکستان بھاگ رہے تھے۔ اس خدمت کے پیچھے کسی قسم کی مالی منفعت کا خیال بھی ان کے دِل میں نہیں تھا، لیکن اگر ادھر اُدھر سے تھوڑی بہت رقم ہاتھ لگ جاتی تو اس سے انکار بھی نہ کرتے۔ ویسے منھ کھول کے کسی فریق سے کبھی ایک پیسہ بھی نہ مانگا۔ جھوٹ سچ کہنے والوں کی گردن پر، کہا جاتا ہے کہ ان کی اپنی دوسری بیوی سے سخت لڑائی ہوئی، اسے مارا پیٹا اور وہ پاکستان بھاگ گئی۔ مکان اسی کا تھا اس لیے ضبط ہو گیا۔ ان کی پرانی خدمات کا ذرا بھی خیال نہیں کیا گیا۔ اب بیچارے کے پاس سر چھپانے کی بھی جگہ نہ تھی۔ دوسرا مکان اس لیے نہیں لیا کہ کرایہ

کہاں سے دیتے۔ ان ہی دنوں ان کے دل میں خدا سے لَو لگانے کا خیال پیدا ہوا، اور پھر اس کی رحمت سے دل کچھ ایسا پلٹا کہ دنیا کی ساری چیزوں سے نظریں پھیر لیں۔ اور اب حالت یہ ہے کہ نیا کپڑا بھی بنواتے ہیں تو اسے پھاڑ کر پیوند لگا لیتے ہیں تاکہ پرانا کپڑا پہننے کی عادت برقرار رہے۔ کچھ دنوں کے لیے کٹرہ والی مسجد میں ڈیرہ ڈالا لیکن وہاں کے امام نے زیادہ دنوں ٹکنے نہیں دیا۔ پھر اس مسجد کو آباد کیا، لیکن یہاں بھی سرکاری پوزیشن حاصل نہ ہو سکی۔ اب پیری مریدی کرتے ہیں، داڑھی گردن کے نیچے تک پہنچ چکی ہے۔ مریدوں کو مذہب کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتے ہیں اور مریدوں نے ان کے معمولی اخراجات کا بار اپنے سر لے لیا ہے۔

مسجد کی دوسری نہایت اہم مستقل اور دلچسپ شخصیت سید ہے اور جو رئیس اعظم یوسف حسن کے کارخانہ میں کام کرتا ہے اور ان کے یہاں موٹر ڈرائیور بھی ہے۔ سیدھا سادہ نیک خصلت اور نہایت شریف قسم کا آدمی ہے، چھوٹی سی چھدری داڑھی، میانہ قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ اور ان سب نے مل کر وہ ایک دل چسپ شخصیت بن گیا ہے۔ نمک حلال اور وفادار ۔۔۔۔ مالک کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔ پسینہ کی جگہ خون بہانے پر تیار رہتا ہے۔ میں جو اس کی زبان سے ”جی ہاں“ اور تسلیم و رضا کے الفاظ سننے کا عادی ہو چکا تھا، ایک دن کچھ عجیب طرح کی باتیں سن کر حیران رہ گیا۔ میں نے یوسف صاحب کی تعریف کی تو اس نے میری تائید میں گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے کچھ شک ہوا تو میں نے اس کی وجہ پوچھی، پہلے تو وہ ٹال گیا اور اپنی برما کی زندگی کے واقعات سنانے لگا۔ پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ بولا ”ویسے تو بابو جی آدمی بڑے اچھے ہیں ۔۔۔“

”ہاں بھائی واقعی ایسے شریف لوگ ان دنوں کہاں ملتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

اس پر اس نے بتایا کہ آدمی تو بڑے اچھے ہیں، پر کبھی کبھی ایسی بات کر دیتے ہیں کہ طبیعت کرکری ہو جاتی ہے۔ ”کرکری۔“ اس کا تکیۂ کلام ہے۔ ”بات کیا ہے؟“ میں نے اصرار کیا۔

”اب کیا بات۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے بابو جی سے کہا کہ آپ کے کارخانہ میں کام کرتے دو اوپر دس سال ہو گئے، اب پچپن میں گزارہ نہیں ہوتا تو بولے۔“ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ

کرنہایت آہستگی سے کہا، ”کیا کریں، ہمارا کارخانہ تو گھاٹے پر چل رہا ہے تم ایسا کرو کہ کسی اور جگہ کام کرلو۔ اب یہی دیکھو مستری کو بھی تین اوپر روز مل ہی جاتے ہیں، اس طرح نوے تو تمھارے ہی ہو جایا کریں گے، پھر یہاں جب کوئی اچھی جگہ ہوگی تو تم کو بلالیں گے۔ کہو تو تمہارا انتظام کر دوں، لکھ رہے ہو استعفیٰ ۔۔۔۔۔“ میں تو جھٹ تیار ہو گیا لیکن کارخانہ میں کام کرتے ہوئے بدلو سے ذکر کیا تو وہ بولا ”پاگل ہوئے ہو، بارہ سال کی نوکری پر لات مار رہے ہو۔ بابو جی تو چاہتے ہیں کہ روزینہ کی اُجرت پر زیادہ سے زیادہ آدمی رہیں۔ حکومت نے انشورنس کی جو اسکیم چلائی ہے وہ روزینہ کے کام کرنے والوں پر تو لاگو نہیں ہوتی۔ جہاں تم نے استعفیٰ دیا اور انہوں نے دوسرا آدمی رکھا اور پھر بعد میں اگر کوئی جگہ ہوئی بھی تو تم کو روزینہ پر ہی رکھیں گے۔ بات تو کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوئی پر یقین نہیں آیا۔“

”پھر تمھیں یقین کیسے آیا؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولا ”شام کو بابو جی بولے، لکھ لیا استعفیٰ۔ میں نے تین روپیہ روز کی نوکری کا بھی انتظام کر دیا ہے، کل چلے جانا۔ میں نے انکار کیا تو انھیں غصہ آگیا، لگے برا بھلا کہنے ۔۔۔۔۔ اس سے میرا شک پکا ہو گیا ۔۔۔۔۔ آپ کا کیا خیال ہے بابو جی؟“ اس نے مجھ سے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر باہر چلا گیا۔ میں بھلا کیا کہتا؟ کچھ نہ بولا۔

اور ان سب کے درمیان میں ہوں۔ میں یونیورسٹی کا ایک معمولی طالب علم ہوں۔ اخبار بھی پڑھ لیتا ہوں۔ سیاست سے بھی تھوڑی دلچسپی ہے ۔۔۔۔۔ میری پریشانی یہ ہے کہ میں ان سب میں سے کسی کا مقام متعین ہیں کر پاتا۔ یوسف صاحب نہایت نیک اور دیندار آدمی ہیں۔ شہر کی کئی درسگاہوں کی امداد کرتے ہیں۔ متعدد یتیم خانوں کے معاونین کی فہرست میں ان کا نام سرِفہرست ہے، صبح شام چار پانچ فقیر کچھ نہ کچھ لے ہی جاتے ہیں۔ ان کا ڈرائیور سید بھی نہایت شریف ہے میں نے اس کو غلط بات کہتے کبھی نہیں سنا، سیدھا سچا مسلمان معلوم ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ کریم صاحب کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اس طرح برباد ہوتے، پتنگ اُڑاتے اور وقت برباد کرتے ہوئے دیکھ کر جب میں غصہ سے باہر نکلتا ہوں تو وہ اتنی لمبی داڑھی کے باوجود جھک کر سلام کر لیتے ہیں اور میرا غصہ کافور ہو جاتا ہے۔

فضلو جو اس مسجد کے پیش امام ہیں ہو سکتا ہے کسی زمانے میں ایسے ویسے رہے ہوں۔ کیا لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہو سکتا کہ کوئی پرانی باتیں چھوڑ کر ایک نئی زندگی شروع کر سکتا ہے، لیکن مجھے اس بات کا یقین کیوں نہیں آتا۔۔۔۔؟ اور طوائف آخر طوائف ہی ہے، اگر ایمانداری، رحم اور خلوص یا اس قسم کی ایک آدھ خوبی اس میں ہو بھی تو بھلا اس کی کیا قیمت۔۔۔۔؟ میں اسی طرح کے خیالات میں اُلجھا رہتا ہوں، ان سب میں کس کو کس پر ترجیح دوں، اور کس بنیاد پر۔

اخلاقیات کے معیار سے ان میں کون سب سے اونچا ہے۔ اور کون سب سے نیچا؟ کچھ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟ میں آپ کی مدد کا خواستگار ہوں۔

■ ■

دوسرا آدمی

ہیم وتی نے کھچا کھچ بھری عدالت میں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے جادو ناتھ کو دیکھا اور مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اس کے وکیل نے ایک بار پھر پوچھا۔ “تم نے قاتل کو دیکھا تھا؟”

“جی ہاں.....” اس نے مختصر سا جواب دیا۔

“تمھارے سامنے ہی اس نے سرجو پر چھرے سے حملہ کیا تھا.....؟”

“.....میں نے دیکھا تو چھرا میرے پتی کے سینے کو کاٹتا ہوا دوسری طرف نکل گیا تھا .....ان کی قمیص آگے اور پیچھے دونوں طرف خون میں لت پت ہو رہی تھی۔”

“پھر.....” وکیل نے ایک سچے واقعہ کو عدالت اور مقدمے کے مطالبات کے چوکھٹے میں جس طرح سجایا تھا اس کی ایسی کامیاب تصویر دیکھ کر پوچھا، “پھر کیا ہوا.....؟”

“وہ بھاگا لیکن لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور پھر پولیس کے حوالے کر دیا۔”

یہ ساری باتیں ہیم وتی نے ایسی خاموشی اور جذبات سے خالی لہجے میں کہیں کہ اس کو اپنی ہی آواز پر دھوکا ہونے لگا کہ وہ خود اس کی آواز ہے یا کسی اور کی.....اس نے سوچا کہ وہ اپنے پتی دیو کے قتل کے مقدمے میں گواہی دے رہی ہے، یا کسی اجنبی کے قتل کے مقدمے میں۔ لیکن کسی اجنبی کا قتل بھی تو دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیتا ہے، آنسوؤں کو پلکوں پر لا کر انھیں خشک زمین پر گر کر سوکھ جانے کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ مگر اس وقت سارا واقعہ وہ اس طرح بیان کر رہی ہے جیسے اس سے اس کا کچھ لینا دینا نہ ہو۔ اس نے ایک بار پھر

اپنے دل کے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس کی زندگی برباد ہوئے پورے دو سال بھی تو نہ ہوئے تھے۔ لیکن کیا اب اس کے پاس ۔۔۔۔ پتی دیو پر بہانے کے لیے ایک آنسو بھی نہیں رہ گیا تھا؟

''تم قاتل کو پہچان لوگی نا ۔۔۔۔؟''

ہیم وتی نے ایک بار کنکھیوں سے جادو ناتھ کی طرف دیکھا ۔۔۔۔ جادو ناتھ اسی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا، اس نے بھی دھیرے دھیرے پُتلیاں ہیم وتی کی طرف گھمائیں تو ہیم وتی نے پہلی بار دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے کونوں میں میل بھرا ہے، داڑھی کے بال کھچڑی ہو گئے ہیں۔ کنپٹیوں کے بال جن میں ایک آدھ سفید تار پہلے بھی چمک جاتا تھا، اب بالکل سفید ہو گئے ہیں ۔۔۔۔ پیشانی جہاں ہر وقت موٹی موٹی تیوریاں پڑی رہتی تھیں، جیسے وہ غصہ میں ہو، اب سپاٹ اور بوجھل ہو گئی ہیں۔

اس کے دل میں ایک لہر سی آئی اور عدالت کے کمرے میں پوری رفتار سے چلنے والے کئی پنکھوں کے نیچے جیسے وہ پسینہ سے تر ہو گئی ۔۔۔۔ سرجو بابو خود تو مزے سے چلے گئے اور اس کے ایک ایک لفظ کو اس طرح اہم بنا گئے۔

وہ دن بھر باتیں کیا کرتی، خود سرجو بابو سے اُلٹی سیدھی باتیں کرتی، دن بھر بچوں سے ایسی باتیں کیا کرتی جنھیں اب سوچتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے ان کا کوئی مطلب ہی نہیں، کوئی معنی ہی نہیں ۔۔۔۔ ایسی باتیں جن کے کہنے نہ کہنے سے کسی زندگی کا کچھ بنتا بگڑتا نہیں۔

اس کا ایک چھوٹا سا گھر تھا، اس کے پتی کا نام سرجو تھا لیکن اس نے آج تک کسی کو انھیں اس طرح نام لے کر پکارتے نہ سنا تھا نہ دیکھا۔ وہ بیاہ کر آئی تو ساس سُسر اس کے پتی دیو کو بابو کہتے تھے، اس کے چھوٹے سرجو بابو۔ موسا، چاچا، پھوپھا کہہ کر اُنھیں کوئی نہ پکارتا۔ بابو ان کے نام کا حصہ بن گیا تھا، محلہ والے بھی سرجو بابو کہتے تھے۔ اتنے بہت سے لوگوں کو اسے سرجو بابو کہتے سن کر وہ خود بھی انہیں یہی کہنے لگی تھی۔ کبھی کبھی جب بہت جذباتی ہو جاتی اور جب بہت پیار آتا اور جب نام لینا اچھا لگتا تو اس وقت بھی اپنے اوپر بہت قابو پا کر بس بابو ہی

کہہ پاتی۔ پھر پپو ہوئی اور اس کے بعد ڈولو، اور یہ دونوں بھی پتا جی، پاپا، یا ڈیڈی کے بجائے بابو ہی کہنے لگے۔

سرجو بابو سیدھے سادھے آدمی تھے، نہ کسی سے لڑائی نہ جھگڑا، دفتر سے گھر، گھر سے دفتر، یہ اُن کا روز کا معمول تھا۔ بہت ہوا تو شام کو بیوی بچوں کو لے کر محلّہ کے پارک میں چلے گئے یا مہینے میں ایک یا دو بار سنیما ہو آئے، وہ بھی بہت کہے سنے۔۔۔۔ محلّے کے سب لوگ اُن کی عزت کرتے، خود جادو ناتھ جو یوں بھی محلّے میں کسی سے کچھ نہ بولتا، اُنھیں دیکھتا تو نمسکار ضرور کرتا، اور اگر وہ بھی ساتھ ہوتی اور سڑک پر مل جاتا تو گردن اُٹھا کر ان کی طرف دیکھتا بھی نہیں، بس یوں ہی گذر جاتا۔

جب سے ڈولو ہوا تھا اس کے ساس سُسر بھی ذرا بے نیاز ہو گئے تھے، اب وہ دونوں ایک جگہ جم کر نہ رہتے، کبھی چھوٹے بیٹے کے یہاں امرتسر چلے جاتے اور کبھی الہ آباد جا کر ملازمت کے زمانے میں بنوائے مکان میں دو چار مہینے گزار آتے۔ ماتا پتا امرتسر سے واپس آنے لگتے تو وہ چھوٹے بھائی راکیش اور اُس کے بیوی بچوں کو بھی بلا لیتا، گھر بھر جاتا، بلکہ چھلک پڑتا۔ وہ لوگ دس پندرہ دن رہ کر چلے جاتے تو پھر چہل پہل ڈوب جاتی، کبھی ہیم وتی میکے چلی جاتی تو وہ ہوٹل میں کھانا کھاتا اور خالی وقت میں سارا اخبار دو بار پڑھ جاتا۔ سرخیوں سے لے کر ضرورتِ رشتہ کے کالموں سے ہوتا ہوا آخری صفحہ پر کھیل کود کی خبروں اور پرنٹر پبلشر کے نام تک۔

پھر جب اس طرح بیس پچیس دن گزر جاتے اور پپو اور ڈولو کے لیے لائی ہوئی ٹافیوں سے سرہانے کا تکیہ ذرا اونچا ہو جاتا تو وہ ہیم وتی کو خط لکھ دیتا، ”جلدی آجاؤ، نہیں تو میں اکیلے رہنے کا عادی ہو جاؤں گا۔“ اور ہیم وتی بس تین چار دن میں آجاتی۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی تکیہ اُٹھاتی تو پچاس ساٹھ ٹافیاں رکھی ہوئی ملتیں۔ بچے ان پر ٹوٹ پڑتے تو وہ پوچھتی۔۔۔۔

”اور میرے لیے۔۔۔۔؟“

”ہے کچھ لیکن ابھی نہیں بعد میں دوں گا۔“

اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے تو دونوں کی آنکھوں میں شرارت ناچتی اور وہ مسکرا دیتے۔

یہ تھی ان کی زندگی ۔۔۔۔ اس میں نہ کوئی اُتار تھا نہ چڑھاؤ۔ دو بچوں کی ماں ہیم وتی، دو بچوں کا باپ سرجو، بلکہ سرجو بابو۔ چھ ساڑھے چھ سو روپے تنخواہ، ایک سو پندرہ روپے دو کمروں کے فلیٹ کا کرایہ، نہ لڑائی نہ جھگڑا۔

پھر ایک دن سرجو بابو کا قتل ہو گیا۔

رانڈ کا سانڈ جادو ناتھ ہر روز رات گئے نشہ میں دُھت گھر لوٹتا۔ سرجو بابو کے فلیٹ سے لگے ہوئے ایک خستہ حال مکان میں بڑبڑاتی، اسے برا بھلا کہتی اور اپنی قسمت کو کوستی، بوڑھی ماں خاصی دیر بعد دروازہ کھولتی، بیٹے کو برا بھلا کہتی، غصہ میں اپنے سن سفید بال نوچتی، روتی پیٹتی اور سو رہتی۔ کبھی کبھی پولیس والے رات گئے آتے، گالیاں بکتے، جادو ناتھ نہ ملتا تو پولیس چوکی بھیج دینے کے لیے اس کی ماں کو ہدایت کر جاتے۔ پانچ چھے سال سے یہ سب کچھ راجندر نگر کے C/1 کا معمول بن گیا تھا۔ اب کوئی اس مسئلہ پر بات کرتا، نہ کچھ کہتا۔

جادو ناتھ ساری دنیا میں جو بھی کرتا ہو لیکن محلّہ والوں نے نہ اُسے جوا کھیلتے دیکھا تھا نہ نقب لگاتے، نہ کبھی کسی سے اس نے بدتمیزی کی تھی، نہ محلّے کی لڑکیوں کو چھیڑا نہ کسی پر جملہ بازی کی ۔۔۔۔ چوڑا چکلا سینہ، کھلتا ہوا گندمی رنگ، ترشی ہوئی مونچھیں، گھنی سیاہ بھنویں جن میں دو مغرور آنکھیں ہر وقت چمکا کرتیں۔

پھر اُس رات وہ ہو گیا جو نہ ہوتا تو آج ہیم وتی کمرۂ عدالت میں کھڑی نہ ہوتی، سفید ساڑی پہنے۔

رات گئے سرجو بابو نے اپنے گھر کے سامنے زور زور سے باتوں اور لڑائی جھگڑے کی آواز سنی تو وہ باہر نکل آئے۔ جادو ناتھ نشہ میں دُھت رکشہ والے سے پیسوں پر جھگڑ رہا تھا۔ ہیم وتی نے اندر سے پوچھا، ”کیا بات ہے؟“ تو سرجو بابو نے کہا، ”کچھ نہیں، ابھی آتا ہوں ۔۔۔۔“ پھر جب باہر سے آنے والی تیز تیز آوازوں میں اُس کے پتی کی آواز بھی شامل ہو گئی تو وہ

باہر نکل آئی۔ اس نے دیکھا کہ جادو ناتھ کے ایک ہاتھ میں چھرا ہے اور دوسرے ہاتھ سے وہ رکشہ والے کا گریبان پکڑے ہے۔ اسی سمے سرجو بابو نے جادو ناتھ کے ہاتھ کو جھٹکا دیا تو رکشہ والے کے گریبان پر اس کی گرفت کمزور ہو گئی۔ جھٹکے کے زور سے جادو ناتھ لڑکھڑایا، پھر سنبھلا، اس کا سیدھا ہاتھ جس میں چھرا تھا، ہوا میں لہرایا اور چھ انچ لمبا چھرا سرجو بابو کے سینے میں اتر گیا۔ سرجو بابو "ہائے رام" کہہ کر گر پڑے۔ جادو ناتھ بھاگا لیکن رکشہ والے کے پہیے سے ٹکرا کر گر پڑا۔۔۔۔ ہیم وتی کے منھ سے ایک چیخ نکلی اور وہ بھی پتی دیو کے ٹھنڈے جسم پر گر پڑی۔

اندر مکان میں اب بھی فرمائشی گانوں کا پروگرام ہو رہا تھا۔

ہیم وتی چپ چاپ گم سم کھڑی جادو ناتھ کو دیکھتی رہی تو وکیل نے اپنا سوال دہرایا ۔۔۔۔"تم قاتل کو پہچان لو گی نا۔۔۔۔؟"

ہیم وتی نے گردن جھکائی اور آہستہ سے کہا۔۔۔۔ "ہاں۔۔۔۔" اب وکیل نے آخری سوال داغ دیا۔۔۔۔ "کیا یہی تھا قاتل۔۔۔۔ جادو ناتھ؟"

اب اس کی آنکھیں جادو ناتھ کے چہرے پر گڑی تھیں۔۔۔۔ یہی ہے قاتل۔۔۔۔ لہراتا ہوا چاقو اس کے پتی کے سینے میں اتار دینے والا۔۔۔۔ یہی ہے جادو ناتھ، سفید بال، جھکے ہوئے کندھے، کانپتی ہوئی ٹانگیں، میل بھری آنکھیں، جبڑے سے لگے ہوئے گال، مغرور آنکھوں کے بجائے بھیک مانگتی ہوئی آنکھیں۔ کیا اسی نے میرے پتی کو قتل کیا تھا۔ ایسا کائر، ایسا بزدل آدمی تو سرجو بابو کو مار نہیں سکتا تھا، سرجو بابو ایسے گئے گزرے نہ تھے۔

ہیم وتی نے ایسی نظروں سے جن میں شاید غصہ بھی تھا، شاید رحم بھی تھا، شاید غرور بھی تھا، جادو ناتھ کو دیکھا اور انکار میں گردن ہلا دی۔

"نہیں۔۔۔۔ وہ یہ آدمی نہ تھا۔۔۔۔ وہ کوئی دوسرا آدمی تھا۔"

■ ■

وہ ایک لمحہ

شوکت بیگم نے مغرب کی نماز ختم کرکے اپنی بھانجی صغرا اور بھانجے تسلیم کو بلا کر پھونک ڈالی اور بیٹی نگارش کو ''ہوں'' کر کے اشارہ کیا۔ جو ابھی ابھی نماز پڑھ کر پیچھے مسہری پر آکے بیٹھی تھی اُٹھ کر ان کے پاس آگئی۔ انھوں نے بیٹی کے دودھ سے دھلے سفید چہرہ کو ایک نظر دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ اُس کے سر کی طرف بڑھا دیے۔ ان کی انگلیوں نے پہلے اس کی کنپٹیاں چھوئیں، پھر کان، پھر آنکھیں اور پھر دہانے کے بیچوں بیچ ناک کی سیدھ میں آکر ان کے دونوں ہاتھ مل کر رُک گئے۔ شوکت بیگم نے اسی حالت میں بیٹی کے چہرہ پر پھونک ڈالی اور پھر ان کے ہاتھ دھیرے دھیرے واپس لوٹ گئے۔ کنپٹیوں کے قریب پہنچ کر ان دونوں ہاتھوں نے اس کے چہرہ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ لوگ ٹھیک ہی تو کہتے تھے۔ ماں بیٹیاں بس بہنیں معلوم ہوتیں، وہی سیدھی ستواں ناک، چھوٹا سا دہانہ۔ ایسا کہ جیسے کبھی بول ہی نہ پھوٹے ہوں، ذرا سے غصہ میں لال ہو جانے والی لویں، گورا رنگ، خوبصورت آنکھیں اور کشادہ پیشانی۔ ان آنکھوں نے یہ سب کچھ ایک ہی بار میں دیکھ لیا اور پھر ان کی نظریں بیچ پیشانی پر مانگ کے قریب آکر ٹک گئیں۔ اے اللہ! ایسی مشابہت بھی کیا۔ نگارش بھی اپنی ماں کی طرح سیدھی مانگ نہ نکال پاتی۔ بیچوں بیچ بھنور تھا اور کنگھی چاہے کتنی ہی دبا کے کیوں نہ کریں، مانگ ذرا سی ٹیڑھی ہو ہی جاتی۔

شوکت بیگم نے اسی طرح چہرہ ہاتھ میں تھامے تھامے ایک بار پھر بیٹی کی طرف دیکھا، انہیں ایسا لگا جیسے وہ بائیس تیئیس سال اُدھر آئینہ دیکھ رہی ہوں، اور پھر اس آئینہ نے بہت

سے عکس دکھائے۔

وہ اتنے ہی دنوں قبل ادھر گرمیوں کی ایک خوش گوار شام کو جب دونوں طرف بجلی کے پنکھے لگے ہونے کے باوجود ان کا سارا جسم پسینے سے تر بتر ہو رہا تھا بیاہ دی گئی تھیں۔ شوہر خوش اخلاق اور منکسر المزاج، خاصے وجیہہ اور رئیس تھے۔ بس ایک بات ذرا ایسی ویسی تھی لیکن اس سے تو یہ کھلتی مسکراتی کلی پہلے ہی واقف تھی اور انھوں نے بھی پہلی ہی ملاقات میں گفتگو کا آغاز شاید اس طرح کیا تھا۔

"بیگم لق و دق مکان ہے، اسے دیکھنے والا بھی کوئی نہیں، خدا کا دیا گھر میں سب کچھ ہے، کسی چیز کی کمی نہیں، لیکن پھر بھی میں مقروض ہوں اور یہ قرض آپ ہی ادا کر سکتی ہیں۔"

وہ خاموش رہی تھی۔

"بولیے اس قرض کی ادائگی میں آپ میری مدد کیجیے گا نا۔"

اب بھی شوکت بیگم کے منہ سے جو اس وقت گھر میں شکّو کہلاتی تھیں، ایک بول بھی نہ پھوٹا تھا۔

"بولیے نا، کیا میں سمجھوں کہ آپ کو میری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں؟"

اب وہ بڑی مشکل سے بول سکی تھی، "ہے کیوں نہیں۔"

"تو پھر بتائیے آپ اس سلسلہ میں میری مدد کریں گی؟"

"آپ اور مقروض؟"

"جی ہاں بیگم میں مقروض ہوں۔ مرحومہ نے جاتے جاتے وصیت کی تھی، وصیت کیا مجھ سے روتے ہوئے کہا تھا کہ میں فرخند کو اس بات کا احساس بھی نہ ہونے دوں گا کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔ مرحومہ کی اس خواہش کی تکمیل میرے اوپر قرض ہے، اور یہ قرض آپ ہی ادا کر سکتی ہیں۔"

وہ دن اور آج کا دن انھوں نے شوکت بیگم کو بیگم سے کم کسی لفظ سے خطاب ہی نہیں کیا، شکّو یا اس قسم کا کوئی اور لفظ سننے کے لیے ان کے کان ترس گئے۔ نئی نویلی دلہن نے شروع شروع میں تو خود کو خوش فہمیوں میں مبتلا رکھا، شوہر کی دسمبر، جنوری میں ٹھنڈی پانی سے نہلائی

ہوئی گرم جوشی کا کچھ بڑھ چڑھ کر ہی جواب دیا۔ لیکن یہ جواب ایسا ہی ہوتا جیسے کوئی امتحان کے پرچے میں خود ہی سے سوال قائم کر کے جواب لکھ آئے ۔۔۔ یہ جواب خود اپنا منہ چڑھا کے رہ جاتا اور اس کے لال رخساروں اور پنکھڑی ایسے ہونٹوں پر سر شام ہی اُداسی کی ایک تہہ جم جاتی اور یہ تہہ شوہر کی اپنی بساط بھر کوششوں کے باوجود نہ اُتر پاتی۔ خواب دیکھے تھے، ہم سنی کی رفاقت کے اور یہاں ملا مشفقانہ برتاؤ، کبھی کبھی تو وہ سچ مچ رو دیتی۔

آئینہ نے ذرا سا رُخ بدلا اور اب سامنے ایک اور تصویر تھی۔ فرخند نے ساتواں درجہ پاس کر لیا ہے اور اس کا داخلہ دوسرے اسکول میں ہو رہا ہے، جاڑوں کی چھٹیوں کے بعد اس نئے انگریزی اسکول میں وہ پہلی بار جا رہا ہے۔ بستہ میں کتابیں، پینسل اور کاپیاں شوکت بیگم نے خود اپنے ہاتھ سے رکھی ہیں۔ بستہ کمر میں ٹانگے فرخند مسہری کے سامنے کھڑا ہے۔ ماں نے بوسہ دیا۔ فرخند نے جواباً ماں کی پیشانی کو چوما۔ ''ممی ٹاٹا، ممی ٹاٹا۔'' ان تین چار برسوں میں اسے اپنی مرحوم ماں کا ایک بار بھی خیال نہیں آیا۔

شادی کے بعد آٹھ برساتیں گزرنے پر نگارش اس دنیا میں آئی، اور اس کی سب کچھ بن کے رہ گئی۔ شوہر صبح صبح اُٹھ کر دوکان چلے جاتے، شادی کے بعد کچھ دنوں تک دوپہر کا کھانا کھانے گھر آتے رہے، پھر کبھی کبھی دوکان پر ہی منگانے لگے اور دھیرے دھیرے یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ اب دوپہر میں اُن کا گھر آنا ہی ختم ہو گیا۔ شام کو دوکان سے واپس آتے تو تھکے تھکائے، نڈھال تجوری کی چابی اور نوٹوں کی تھیلی بیوی کے حوالہ کر دیتے اور وہ روپے تجوری میں رکھ دیتیں۔ ویسے ایک چابی ہمیشہ شوکت بیگم کے پاس رہتی۔ کتنا کس کو دیا، کیا کیا خرچ کیا، شوہر نے ایک بار بھی نہ پوچھا تھا۔

اور اب وہ اوپر کے کوٹھے پر سونے لگے تھے، بچی رات کو ایک آدھ بار ضرور روتی۔ آنکھ کھل جاتی تو گھنٹوں نیند نہ آتی اور دن کو دوکان کے کام کا حرج ہوتا۔ اب ملاقات کے بس دو ایک ہی مواقع رہ گئے تھے۔ صبح چائے کی میز پر، رات کے کھانے پر یا جمعرات کے دن جب دوکانیں بند ہوتیں۔ شوہر کی یہ ذمہ داریاں تھیں ہی کیا کہ ان میں کمی ہوتی، البتہ نگارش نے فرخند کے لاڈ پیار میں سے تھوڑا سا حصہ بٹا لیا تھا۔ اب وہ اسکول سے لوٹ کے آتا

اور شوکت بیگم نگارش کو دودھ پلا رہی ہوتیں تو کریمن بوا میز پر کھانا لا کر رکھ دیتیں۔ شروع شروع میں تو فرخند نے اس تبدیلی کو خاصا محسوس کیا لیکن دھیرے دھیرے عادی ہو گیا۔ کھانا کھانے کے بعد جھولے کے پاس کھڑے ہو کر سیٹی بجاتا تو نگارش غوں غوں کر کے ہاتھ پیر مارتی اور مسکراتی۔

اب ایک اور تصویر تھی۔

گرمیوں کی ایک چلچلاتی دوپہر کو ایک تانگہ گھر کے سامنے آ کر رکا اور نوکر نے اطلاع دی کہ جاوید صاحب آئے ہیں۔ جاوید جسیم صاحب کے رشتہ کا بھائی تھا۔ شادی سے پہلے ہی سے شوکت بیگم اور جاوید کے گھر والوں میں آنا جانا تھا، اور شوکت بیگم کے یہاں کوئی خاص پردہ بھی نہ تھا، اس لیے جاوید سے پردہ کرنے کا سوال ہی نہ اُٹھتا تھا۔ لیکن ایک تو شادی کے بعد اتفاق سے دونوں کا اب تک سامنا نہیں ہوا تھا، اور دوسرے شوہر کی خواہش کے مطابق اب وہ پردہ، پردہ بھی کیا کانا پردہ کہیے، کرنے لگی تھیں، اس لیے پہلے تو جھجکیں پھر جلدی سے دوپٹہ قاعدہ سے کر کے باہر کے دالان میں مہمان کے استقبال کے لیے جا کھڑی ہوئیں۔

جاوید بھائی جو شادی میں تو شریک تھے لیکن جنھیں یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی بھابی کتنی جلدی ”شکو“ سے شوکت بیگم بن گئی ہیں، اندر داخل ہوئے۔ رشتہ ہی مذاق کا تھا۔۔۔ مسکرا دیے۔ شوکت بیگم نے مسکراہٹ کا جواب ہلکے سے تبسم سے دیا۔ گرد و غبار سے اَٹے ہوئے جاوید بھائی تھوڑی دیر میں منھ ہاتھ دھو کر کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ شوہر کا کھانا پہلے ہی دوکان جا چکا تھا، انتظار کا کوئی سوال نہ تھا۔ شوکت بیگم بھی مہمان کا ساتھ دینے بیٹھ گئیں۔ کھانے کے دوران اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شوکت بیگم دور دور کے رشتہ داروں کی خیر خیریت پوچھ ڈالی۔ منیرہ جو گھر کی ذمہ داریوں کی وجہ سے سسرالی عزیزوں کے یہاں کم ہی جا پاتی تھی، بی بی اب کیسی ہیں، کیا اب بھی کام کرنے آتی ہیں، اب تو اُن کے بال سن سفید ہو گئے ہوں گے، کنویں کے پاس والے گولر کے درخت کے نیچے جو سنار رہتا تھا اس کی لڑکی تو اب خوب بڑی ہو گئی ہوگی۔ لڑکیوں کے اسکول میں کون کون سی پرانی استانیاں رہ گئی ہیں اور اسی

طرح کے نہ جانے کتنے سوالات ۔۔۔۔

بوا نے میز پر سے برتن اُٹھائے اور لڑکے نے دالان کے بائیں در میں سلفچی رکھ کر جاوید بھائی کے ہاتھ دھلائے اور ٹاٹ کے پردے گرا دیے گئے۔ جب سے نگارش کو لو لگی تھی دس بجے سے ہی دالان کے پردے گرا دیے جاتے تھے۔ آج نہ جانے کیسے اب تک کسی کو خیال نہ آیا تھا۔۔۔۔ جاوید بھائی نے تولیے سے ہاتھ پونچھے اور ریڈیو پر رکھی ہوئی فرخند کی رنگین تصویر دیکھنے لگے۔ ابھی وہ تصویر دیکھنے ہی میں محو تھے کہ اندر جھولے پر سے نگارش روئی۔ نگارش اس وقت بمشکل سال بھر کی ہوگی۔ جاوید بھائی نے کان کھڑے کیے، شرارت بھرے انداز میں مسکرائے۔۔۔۔ پھر بولے۔

''واہ بھابی، آپ نے یہ کارنامہ کب کر ڈالا؟''

جاوید بھائی بھی عجیب لااُبالی انسان تھے۔ شادی کے نام سے رسّی تڑاتے۔ ماں ٹھیک ہے جب تک زندہ رہے، اسی اُمید پر جیے کہ بیٹے کا سہرہ دیکھیں گے۔ مرے تو سہرا دیکھنے کی تمنا اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ اب لے دے کے ماں رہ گئی تھی۔ دکھیاری ماں نے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن جاوید بھائی نے ''ہاں'' کر کے نہ دی۔ جب بات چلتی ٹال جاتے۔ آخر ماں غریب نے بھی ہار مان لی۔ باپ نے اچھی خاصی جائیداد اور نقد روپیہ چھوڑا تھا، اکلوتی اولاد تھے۔ پیسے کی کبھی تنگی نہ ہوئی۔ لکھنؤ میں رہتے۔ دن بھر ہوٹلوں اور کافی ہاؤس کا چکر لگاتے، شام کو کسی دوست یار کے یہاں سو رہتے۔ دوست آدمی تھے جس محفل میں بیٹھتے جانِ محفل بن جاتے۔ جس کے یہاں رہتے یارِ شاطر بن کے رہتے۔۔۔۔ جب پیسے کم پڑتے گھر جا کے اور لے آتے۔ ان کی اس طرح کی زندگی کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور ہو تھیں۔ کوئی کہتا تھا جوانی میں کسی کو دل دے دیا تھا وہ بے وفائی کر گئی اور یہ اب تک اس غم کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں، کوئی کہتا تھا کسی رنڈی کو بٹھا لیا ہے، کوئی کچھ۔ غرض جتنے منھ اتنے باتیں لیکن ایسا لگتا کہ جاوید بھائی ان باتوں پر ذرا بھی کان نہ دھرتے۔ ابھی کافی ہاؤس میں اس ٹیبل پر بیٹھے قہقہہ لگا رہے ہیں تو ابھی اُس ٹیبل پر، غرض دن یونہی گزر جاتا۔ بلکہ کہنے والے تو مذاقاً یہاں تک کہتے کہ صبح آ کے کافی ہاؤس کھلواتے ہیں، اور رات کو اپنے سامنے بند

کرا کے جاتے ہیں۔

شوکت بیگم بس مسکرا کر رہ گئیں تو جاوید بھائی نے اپنا سوال دہرایا۔

"آپ تو خوب خفیہ خفیہ کارنامے کر ڈالتی ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔" اور یہ کہہ کر وہ ایک ہی جست لگا کر اندر کمرے میں پہنچ گئے اور نگارش کو گود میں لے کر باہر دالان میں آگئے۔ بچی تھی کہ چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی، گود میں لے کر بہلایا، طرح طرح سے چمکارا، پیار کیا، جھنجھنا بجایا پر اُسے چپ نہ ہونا تھا نہ ہوئی۔۔۔۔ شوکت بیگم نے اصرار بھی کیا لیکن جاوید بھائی نے نگارش کو گود سے نہ چھوڑا۔۔۔۔

"ایسا ہی بچہ کھلانے کا شوق ہے تو شادی کیوں نہیں کر ڈالتے۔" شوکت بیگم نے کہا۔ پھر دوپٹہ کو سینے پر سنبھالتے ہوئے بولیں۔ "شادی کر ڈالیے پھر دو سے تین ہوتے کتنے دن لگتے ہیں۔"

جاوید بھائی پہلے تو مسکرائے پھر ہنسے، پھر زور سے ہنسے۔ پھر قہقہہ لگایا اور پھر یکایک چپ ہو گئے۔ بولے۔

"کیا کہا بھابی، شادی کر ڈالوں۔"

"کیوں کیا بری بات کہی۔" بھابی مسکرائیں۔ "اب کب تک جہانیاں جہاں گرد بنے بنے پھرو گے۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے، دن بھر ہوٹلوں کے چکّر کاٹے شام کو کسی کے یہاں کمر ٹکالی۔"

جاوید بھائی خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھتے رہے، پھر نگارش کو چمکارا تو اس نے ماں کی طرف دیکھ کر ایک ہچکی لی۔ جاوید بھائی نے اس کے منہ میں سیدھے ہاتھ کی ایک انگلی ڈال دی تو وہ چوسنے لگی، وہ بولے۔

"اب کیا شادی کرلوں، کرنا ہوتی تو کب کی کر چکا ہوتا۔"

"کیوں اب کیا ہوگیا۔۔۔۔ کیا بوڑھے ہو گئے۔۔۔۔؟"

یہ بات اُس وقت شوکت بیگم نے یونہی کہہ دی تھی لیکن اس کے پیچھے لاشعور میں ان کی ساری زندگی تھی۔ جاوید بھائی اب بھی ان سے بمشکل سات آٹھ سال بڑے ہوں گے، جب کہ

خود ان کی شادی دس سال قبل جسیم صاحب سے ہوئی تھی تو وہ کسی طرح چالیس بیالیس سے کم نہ تھے۔ پھر بھی ان کی شادی شدہ زندگی کامیاب ہی تھی۔ ان دس برسوں میں ایک بار بھی ان کی شوہر سے لڑائی نہ ہوئی تھی۔ لڑائی تو دور کی بات کبھی اختلاف کی نوبت تک نہ آئی تھی۔ اور لڑائی ہوتی بھی تو کیسے؟ دونوں کے راستے اتنے الگ الگ بلکہ متوازی تھے کہ ان میں کسی ٹکراؤ کا امکان ہی نہ تھا۔ جو جسیم صاحب کے پاس تھا اسے دینے میں انھوں نے کبھی آنا کانی نہ کی تھی، جو ان کے پاس نہ تھا، اس کی شوکت بیگم نے کھل کر کبھی چاہ نہ کی تھی۔ انھوں نے خود انگاروں سے ہاتھ تو نہ سینکے تھے لیکن دوسروں کو ہاتھ سینکتے دیکھا نہیں تو سنا ضرور تھا۔ یہاں آگ ہی نہ تھی تو انگارے کہاں سے ہوتے، اور بھوبل کے سامنے خواہ مخواہ ہاتھ پھیلانے سے کیا حاصل؟ دوسری طرف کی ٹھنڈی راکھ نے ان کے دل کے انگاروں کو بھی تقریباً بجھا دیا تھا۔ کبھی کبھی اس راکھ میں ایک آدھ چنگاری سلگ اُٹھتی لیکن وہ خود اس کے لیے تیار نہ ہوتیں اور قبل اس کے کہ ان کے دل کے پاس سے ایک کوندا لپکے چنگاری اپنی موت آپ مر چکی ہوتی۔ اس وقت یہ تمام باتیں شعور طور پر شوکت بیگم کے ذہن میں نہ تھیں اور نہ انھوں نے اس مسئلہ پر اس طرح کبھی غور ہی کیا تھا۔ لیکن بے زبان احساسات بھی زبان رکھتے ہیں، اگرچہ وہ ہمارے اور آپ کے طور طریقوں کے پابند نہیں ہوتے۔

اپنے اس سوال کے جواب میں جاوید بھائی کو خاموش دیکھ کر شوکت بیگم بول اُٹھیں۔

”شادی تو اب بھی ہو سکتی ہے۔ ویسے اس وقت کیسے کیسے رشتے آ رہے تھے لیکن جناب کے مزاج ہی نہ ملتے تھے۔“

”اس وقت کی بات چھوڑو بھابی، اب مجھ بوڑھے سے کون شادی کرے گا۔“ جاوید بھائی کی آواز جیسے کسی خالی ڈبہ سے نکل رہی تھی۔

”کیوں کرے گا کیوں نہیں، کوئی بھی کرے گا۔“ بھابی نے مسکرا کے جواب دیا۔

”آپ کر لیجیے گا۔۔۔۔؟“

شوکت بیگم کو ہوش آیا تو انھوں نے خود کو جاوید کے بالکل قریب کھڑا پایا۔ نگارش کو گود سے

لینے کی کوشش کرتے وقت ان کا ہاتھ جاوید بھائی کے بازوؤں کی مضبوط مچھلیوں کے پاس اٹک گیا تھا۔ سانس زور زور سے چل رہی تھی اور کان کی لوؤں میں جیسے چیونٹیاں کاٹ رہی تھیں۔

گرم ہوا کا ایک تھپیڑا آیا اور منہ پر ایک چانٹا رسید کر کے چلا گیا، کان کے پاس ایک گولی سن سے نکل گئی۔ کیا آپ مجھ سے شادی کر لیجیے گا۔۔۔؟ کیا آپ مجھ سے شادی کر لیجیے گا۔۔۔؟ کیا آپ مجھ سے شادی کر لیجیے گا۔۔۔؟ شوکت بیگم پاس ہی بچھی ہوئی مسہری پر گر پڑیں، خاموش بے سدھ، یخ بستہ۔ جاوید بھائی بھی اسی جگہ کھڑے رہے، ساکت وصامت، گم صم، چپ چاپ۔۔۔ نگارش جو تھوڑی دیر قبل جاوید بھائی کی گود میں رو رو کے بلکان ہوئی جا رہی تھی نہ جانے کب کی خاموش ہو گئی تھی۔ شوکت بیگم کچھ دیر تو اسی طرح بے سدھ پڑی رہیں، پھر ادھر اُدھر دیکھے بغیر اندر کمرہ میں جا کر مسہری پر گر پڑیں اور تکیہ میں چہرہ اڑس لیا۔

باہر آنگن میں مئی جون کی لو چل رہی تھی۔ نوکرانی کھانا پکا کے جانے کب کی اپنی کوٹھری میں پڑ رہی تھی۔ ملازم لڑکا بھی کہیں کونے کھدرے میں سو رہا ہوگا۔ فرخند شروع گرمیوں ہی میں اپنی خالہ کے پاس شملہ چلا گیا تھا۔ جاوید بھائی دھیرے دھیرے دالان میں ٹہلنے لگے۔ گھر میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ کبھی کبھی اندر کے کمرہ سے ہچکیوں کی آواز ضرور سنائی دیتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جاوید بھائی نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ انھوں نے کمرہ کا رُخ کیا۔ دہلیز کے پاس جا کر کچھ سوچا۔ پلٹے، پھر اندر چلے ہی گئے۔ شوکت بیگم اسی طرح بے سدھ پڑی تھیں۔ جاوید بھائی مسہری کے سرہانے کچھ دیر کھڑے رہے، پھر بولے۔۔۔

''بھابی۔''

کوئی جواب نہ ملا۔

''بھابی سنیے تو۔۔۔۔''

شوکت بیگم نے ہچکی لی۔

''بھابی مجھے معاف کر دیجیے، میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ ویسے میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔'' جاوید بھائی نے شوکت بیگم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بھائی میرا مطلب یہ ہرگز نہ تھا۔ اچھا اب جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔"

قدموں کی بھاری چاپ۔ پھر ذرا ہلکی، پھر جیسے کسی نے بریف کیس اُٹھایا، ابھی جاوید بھائی دروازہ تک پہنچے تھے کہ کوئی پیچھے کھڑا تھا۔ مڑ کے دیکھا تو شوکت بیگم تھیں، ننگے سر، ننگے پیر، سینہ سے دوپٹہ غائب۔ آنکھیں سرخ اور بال بکھرے ہوئے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کے دیکھا۔۔۔۔ شوکت بیگم ایک دم سے پھوٹ پڑیں۔ "جاوید بھیا! اب کبھی یہاں نہ آنا، ویسے ہی تم کب خط لکھتے تھے، اب اور نہ لکھنا۔ میں تمھاری کوئی خاطر تواضع نہ کر سکی۔ اچھا خدا حافظ۔" شوکت بیگم نے جاوید بھائی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں کے درمیان جیسے سورج تھا، دونوں نے نظریں جھکا لیں پھر جاوید بھائی نے اپنا ہاتھ شوکت بیگم کے سر پر رکھا اور خدا حافظ کہہ کر دروازہ سے باہر نکل گئے۔ شوکت بیگم نے دھیمے سے کہا "خدا حافظ۔" لیکن الفاظ جیسے ان کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئے۔ پھر خود ہی دروازہ بند کیا اور زنجیر چڑھا دی۔ اسی طرح دروازہ سے ٹیک لگائے کھڑی رہیں اور نہ جانے کب اندر آ گئیں۔

سیٹھ صاحب جب شام کو گھر لوٹے تو وہ بخار میں پھنک رہی تھیں۔ فوراً ڈاکٹر بلایا گیا۔ تین چار دن میں بخار اُترا تو شوکت بیگم بالکل بدل گئی تھیں۔ ویسے پہلے ہی گھر میں کون تھا، جس سے باتیں کرتیں، پر اب بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔ صبح شام تلاوتِ کلام پاک ہوتی، پانچوں وقت کی نماز کے علاوہ تہجد اور وظیفے۔۔۔۔ وہ دن اور آج کا دن کسی وقت کی نماز قضا نہ ہوئی۔۔۔۔ کوئی روزہ نہ چھوٹا۔

یہ تصویر بے حد روشن اور واضح تھی۔ جاوید بھائی کی بڑی بڑی لیکن خاموش آنکھیں۔ ان آنکھوں میں چھجے کی طرح کی نہیں تو پتلی لیکن گہری سیاہ بھنویں، بے تحاشہ قہقہہ لگانے، زندگی کو کھلواڑ سمجھنے لیکن ذرا سی بات پر پریشان ہو جانے کی عادت۔۔۔۔ پھر اُس وقت کی اپنی زندگی، شوہر، سال بھر کی نگارش، سارے نقش ایک ایک کر کے سامنے سے گزر گئے۔ شوکت بیگم کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔۔۔۔ اور نگارش جو ماں کے اس برتاؤ سے حیرت زدہ سی ہو گئی تھی، اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ شوکت بیگم نے جزدان میں سے دعائے گنج العرش

نکالی۔ پڑھ کے اپنے اوپر دم کیا تب جا کے کہیں انہیں سکون نصیب ہوا۔

جب سے نگارش کو سن گن لگی تھی کہ پھوپھی جان۔۔۔ اس کے رشتہ کے سلسلہ میں آنے والی ہیں، وہ ماں باپ کے سامنے ذرا کم ہی آتی تھی۔ رات کا کھانا عام طور پر سب ساتھ ہی کھاتے تھے، لیکن اب نگارش اسے بھی ٹال جاتی اور پرسوں جب شوکت بیگم نے یہ دیکھنے کے لیے کہ کسی چیز کی کمی تو نہیں رہ گئی ہے، جہیز کے سارے زیورات اور سلے اور بغیر سلے کپڑوں کو مسہریوں پر سجا دیا تھا تو وہ دن بھر اپنے کمرے سے نہ نکلی تھی۔

یوں تو بات چیت کئی گھرانوں سے چل رہی تھی۔۔۔ دو ایک لڑکے پاکستان کے بھی زیر غور تھے، لیکن ماں باپ اکلوتی بیٹی کو دور دیس بھیجنے کے خیال سے کانپ کانپ جاتے۔ یہاں جن گھرانوں سے رشتے آئے، ان میں سے کچھ کی مالی حالت ایسی تھی کہ نازوں پلی بیٹی کو پلّے باندھنے کے خیال سے کلیجہ منھ کو آتا، کچھ کھاتے پیتے گھرانوں کے رشتے تھے تو بڑی بوٹی کی بات رکاوٹ بن جاتی۔ غرض میاں بیوی اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ شوکت بیگم کی نند سروری بیگم نے ان کی مشکل آسان کر دی۔

ڈرائنگ روم خوب اچھی طرح جھاڑا پونچھا گیا۔ دروازوں، کھڑکیوں کے پردے تبدیل کیے گئے اور اوپر کا کمرہ مہمانوں کے لیے آراستہ پیراستہ کر دیا گیا۔ سروری بیگم خود ہی لڑکے کو لے کر آ رہی تھیں۔ فرخند، الٰہ آباد یونیورسٹی میں ایم۔ اے کر رہا تھا، خود سیٹھ صاحب بھلا کیا اسٹیشن جاتے اور اُن کے علاوہ گھر میں تھا ہی کون جو پیش قدمی کرتا، لیکن جب مہمان اسٹیشن سے باہر نکلے تو شوفر کار لیے موجود تھا۔

شوکت بیگم نے جو شادی کے بعد شوہر کی خواہش پر تھوڑا بہت پردہ کرنے لگی تھیں، لڑکے کو دروازے کی آڑ سے دیکھا اور نند کی زبانی سلام کا جواب کہلا دیا۔ نند نے بہت اصرار بھی کیا لیکن وہ کسی طرح سامنے آنے پر راضی نہ ہوئیں۔ شروع میں جس پابندی سے خاصی اُلجھن ہوئی تھی، وہی اب زیب عادت بن گئی تھی۔ ہماری فطرت ایسی ہی عادتوں اور ترکے میں ملی ہوئی روایات کا نام ہے جنھیں ہم نے نہ جانے کیسے کیسے مقدس نام دے دیے ہیں۔

رات میں کھانے کی میز پر صغرا اور تسلیم کے علاوہ صرف تین افراد بیٹھے، سروری بیگم، جسیم

الدین اور انور۔

نگارش نے اپنی سہیلیوں سے ذکر ضرور کیا ہوگا جبھی تو شمیم، عذرا پروین اور خورشید صبح ہی سے آگئی تھیں، بلکہ عذرا نے تو ابھی سے مذاق بھی شروع کر دیا تھا اور جب کھانا ختم ہونے پر اُسے انور میاں کو مرچوں والا پان کھلانے میں کامیابی ہوگئی تو اس نے نگارش سے چٹکی کاٹ کے کہا۔

"میاں جی سٹ پٹا گئے ہوں گے، پر مُنہ ایسا بنالیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔"

اس پر لڑکیوں نے مل کر ایک زوردار قہقہہ لگایا تو سروری بیگم بولیں۔

"دیکھنا تم سب کی ایسی کٹمس لگائے گا کہ ساری ہنسی ٹھٹھول بھول جاؤ گی۔"

کئی بار بلوانے پر بھی جب نگارش اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلی تو شوکت بیگم نے دالان سے آواز دی۔

"آؤ بیٹی کھانا کھالو۔"

"ابھی آئی امی۔"

نگارش کی مہین سی آواز سنائی دی۔

اور جب نگارش کمرہ سے باہر نکلی تو شوکت بیگم جو اکلوتی بیٹی کو جدا کرنے کے خیال سے ویسے ہی دل برداشتہ تھیں، سنّاٹے میں آگئیں۔ یہ وہی نگارش تھی جو سہیلیوں کے آنے پر مکان بھر میں اُدھم چوکڑی مچایا کرتی تھی۔ وہی دوپٹہ جو گھر میں کھیل کود میں اُتار کر الگنی پر ٹانگ دیا جاتا تھا، اب سر پر اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ ایک بال بھی نہ دکھائی دیتا۔ نگارش نے جیسے تیسے بنا دو چار لقمے کھائے، پھر سہیلیوں کے ساتھ کمرے میں چلی گئی۔ شوکت بیگم نے جو باہر دالان میں بیٹھی بیٹی کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھیں دوپٹہ کے کونے سے آنسو پونچھے اور "یا اللہ" کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

ہونے والی سسرال کی خاطر مدارت، اونچی قلعہ نما کوٹھی، خوش اخلاق ساس، سیٹھ جسیم الدین کی دولت، بڑا نام، بڑا کام اور پھر نگارش ایسی لڑکی جس کی تصویر سروری بیگم پہلے ہی

دکھا چکی تھیں، انور میاں ریشہ ختمی ہو گئے۔ ادھر سیٹھ جسیم الدین کو بھی لڑکے میں کوئی خرابی نظر نہ آئی۔۔۔ لاکھوں میں نہ سہی ہزاروں میں ایک تو ضرور تھا۔ پڑھا لکھا، قبول صورت، شریف خاندان اور وکالت بھی اچھی خاصی تھی۔ انھوں نے تو پہلی ہی نظر میں دیکھ کر فیصلہ کر لیا تھا، پھر اندر آ کر بولے۔

"لو! اللہ نے خود ہی انتظام کر دیا۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ جو سروری کی پسند وہی میری بھی، اور پھر لڑکا بھی گھر ہی کا ہے، دیکھا بھالا، سمجھا بوجھا، سنجیدہ اور خاموش طبیعت۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" شوکت بیگم نے کسی جوش و خروش کا اظہار کیے بغیر جواب دیا۔

بیوی کے منھ سے ہوں ہاں سن کر انھیں کچھ تسلّی نہ ہوئی۔ کہاں تو اتنا جوش و خروش تھا، دن بھر خود باہر کا کمرہ صاف کرایا تھا، اوپر کا کمرہ سجایا تھا، مہمانوں کی آمد کا اتنا انتظار تھا اور کہاں اب "جیسی آپ کی مرضی۔"

بولے، "کیا لڑکا پسند نہیں آیا"

شوکت بیگم نے سروتہ پاندان میں رکھا، گلوری منھ میں دبائی اور بولیں۔ "ارے آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا خوشی میں اُچھلوں کودوں۔ سروری بیگم لاکھ آپ کی بہن سہی، لیکن ہیں تو پرائے گھر کی اور انور میاں ان کے دیور ہی تو ہیں۔ کوئی سسرال والوں کے سامنے بات پکی ہونے سے پہلے ایسی خوشی کا اظہار کرتا ہے، سن لیں گے تو سوچیں گی لڑکی بھاری ہو رہی ہے۔"

بات سیٹھ جی کی سمجھ میں آ گئی۔ انھوں نے اپنے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی پیدا کی۔ لیکن خوشی تھی کہ بتیسی کھول کے باہر نکلی آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر چپ رہے۔ پھر بولے، "بھئی اور چاہے کچھ کہو پر اب تک جتنے لڑکے دیکھے ہیں، ان میں سب سے اچھا یہی ہے۔ بس ذرا عمر زیادہ ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اور ایسا کوئی زیادہ فرق بھی نہیں۔" انھوں نے بیگم کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھی۔ "اور پھر ہم دونوں کی عمروں میں بھی تو کافی فرق تھا، میں تو سروری سے ہاں کہے دیتا ہوں۔"

"آپ کی یہ عمر ہو گئی لیکن جلد بازی نہ گئی۔" شوکت بیگم نے دوپٹہ سر پر ڈالا۔ "کوئی اب

پرانا زمانہ تو ہے نہیں کہ ماں باپ نے جس کو چاہا بیٹی کا ہاتھ تھما دیا۔ نگارش کو پڑھایا لکھایا ہے۔ یونیورسٹی سے ”بی۔ اے“ کرایا ہے تو اُس کا بھی عندیہ معلوم کر لیا جائے۔“

”واہ بیگم! تم رہیں نری بچی کی بچی۔“ جسیم صاحب اس وقت بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ ”اب تم جاؤ گی نگارش سے پوچھنے کہ تجھے رشتہ پسند ہے یا نہیں۔ دیکھا نہیں جب سے انور میاں آئے ہیں اپنے کمرے میں سمٹ کے رہ گئی ہو۔“

شوکت بیگم نے شوہر کی طرف دیکھا اور بولیں، ”وہ شرمیلی ہے اور خود کچھ نہ کہہ پائے تو ہم اسے جس کے چاہیں حوالے کر دیں اور میں نے بھلا یہ کب کہا کہ اس کے دل کی بات معلوم کرنے میں جاؤں گی۔ یہ کام آپ میرے اوپر چھوڑ دیجیے۔ عذرا گھر گئی ہے، شام کو آئے گی تو اسی سے پچھوا لوں گی، ابھی ہاں نہ کیجیے گا۔“

ابھی سروری بیگم سے بھائی یا بھاوج نے ہاں نہیں کی تھی لیکن کل صبح سے اس وقت تک کی خاطر مدارات سے وہ یہ ضرور سمجھ گئی تھیں کہ رشتہ بس پکا ہی سمجھو۔ انھیں یقین تھا کہ کل صبح جب وہ واپس جانے لگیں گی تو انور میاں کی ماں کی طرف سے امام ضامن نگارش کے بازو میں باندھ دیں گی اور یاقوت کی انگوٹھی جو اُن کے بکس کی اوپری خانہ میں ایک ڈبیہ کے اندر محفوظ ہے نگارش کی انگلی میں سرک چکی ہو گی۔

انور میاں کے پاس سے سروری بیگم اوپر کوٹھے پر سے اُتریں تو بے حد مسرور تھیں، اتنی رات گئے تک بھاوج کو جانماز پر دیکھ کر انھیں کچھ حیرت ضرور ہوئی لیکن یہ سوچ کر کہ لڑکی کا رشتہ پکا کرنا ہے تو کچھ دعا درود پڑھ رہی ہوں گی وہ اپنی مسہری پر جا کر دراز ہو گئیں۔ شوکت بیگم نے بوا سے نگارش کو اپنے پاس بلوایا، اور گھٹنے کے قریب جانماز پر ہی بٹھا لیا اور ایک لمبی سی دعا پڑھ کر اس کی پیشانی پر دم کی۔ دونوں ہاتھوں سے بیٹی کی چٹاچٹ بلائیں لیں، اسے سینہ سے لگایا اور پھر اُن کے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے۔ وہ کیا دعا مانگ رہی تھیں، نگارش کی خاک سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے، گلا رندھا ہوا تھا۔ اور سینہ پر بیٹی کے سر کے بوجھ سے آواز دبی دبی نکل رہی تھی، مگر اس نے اتنا ضرور سنا، ”یا اللہ! میرے گناہوں کو معاف کرنا، سوچتی ہوں کس منھ سے تیرے سامنے جاؤں گی، اس میں میرا کوئی

قصور نہ تھا، یا اللہ!" انھوں نے ایک ہچکی لی۔ "میری بیٹی کی زندگی میں ایسا کوئی لمحہ نہ لائیو، اسے آزمائش میں نہ ڈالیو۔"

نگارش تھوڑی دیر تک تو اسی طرح ماں کے سینہ سے سر لگائے بیٹھی رہی، اس کی آنکھیں بھی نم تھیں پر ماں کے سامنے رو کر وہ انہیں اور پریشان نہ کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ کل شام سے جب ماں نے روز کی طرح مغرب کی نماز کے وقت پھونک ڈالتے وقت اُس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا وہ ان دو آنکھوں میں عجیب سی بے چینی اور کرب دیکھ رہی تھی، ایسا کرب اس نے ماں کی آنکھوں میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس نے ایک بار ہمت کر کے کنکھیوں سے ماں کا چہرہ دیکھا بھی لیکن آنکھیں ملانے کی ہمّت نہ ہوئی اور وہ چپ چاپ اُٹھی اور اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

رات گئے تک میاں بیوی کمرہ میں نہ جانے کیا کھسر پھسر کرتے رہے، لیکن صبح جب سیٹھ صاحب ناشتہ کی میز پر آئے تو غصہ سے ان کا منھ پھولا ہوا تھا۔ رات شوکت بیگم نے ان کی نظروں کے سامنے سے فریب کے نہ جانے کون کون سے پردے اُتار کر خود کو ننگا کر دیا تھا کہ ان کے چہرہ کی طمانیت ہی غائب ہو گئی تھی۔ انور میاں اور بہن سے رخصت انھوں نے دوکان جاتے وقت ہی لے لی اور نند کو رخصت کرتے وقت ان کے بے حد منع کرنے پر بھی شوکت بیگم نے صغرا اور تسلیم کی جیب میں دس دس کے دو نوٹ رکھتے ہوئے جس مفصل خط کا وعدہ کیا تھا وہ خط کبھی نہ بھیجا گیا۔

◆ ◆

چھوٹے لوگ

مسٹر چٹرجی نے جو ابھی دو گھنٹے پہلے اپنے بنگلہ کے باہر فٹ پاتھ پر چھوٹی موٹی پان، بیڑی، سگریٹ کی دوکان لگانے والی بڑھیا کو ڈانٹ پھٹکار رہے تھے، کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور اسے کسی کام میں مشغول پا کر جلدی سے دوسری طرف مڑ گئے۔ تھوڑی دور جا کر انھوں نے پھر اسی بڑھیا کی طرف مڑ کر دیکھا اور یہ اندازہ کر کے کہ اس نے انہیں دیکھا نہیں ہے جیسے ان کے سینہ پر سے ایک بوجھ اتر گیا۔

بارہ تیرہ سال ادھر یونیورسٹی اور آئی ٹی کالج کی سڑک پر مسٹر چٹرجی کے بنگلہ کے سامنے اس بڑھیا نے اپنے شوہر کے گزر جانے کے بعد ایک چھوٹی سی دوکان لگالی تھی۔ ان تیرہ برسوں میں نہ جانے کتنے طلبہ یونیورسٹی میں آئے اور چلے گئے، کسی سے ایک پیسہ بھی زیادہ لینا تو دور کی بات، نہ جانے کتنے ایسے ہوں گے جن پر اس کا ہی کچھ نہ کچھ نکلتا ضرور ہوگا۔

سب اسے ماں ہی کہتے۔ ”ماں ایک سگریٹ“۔ ”ماں ایک پان دو“۔ ”ماں دیکھ میرا پیریڈ ہو رہا ہے، جلدی سے میری سگریٹ نکال۔“ اور وہ اپنی سوکھی سوکھی انگلیوں سے جلدی جلدی پان، سگریٹ لڑکوں کو دینے لگتی۔ بھیڑ زیادہ ہوتی اور لڑکے جلدی کرتے تو وہ کہتی، ”کوئی ہاتھ پکڑے ہے، لے کیوں نہیں لیتے“ اور وہ لڑکے جنہیں زیادہ جلدی ہوتی اپنی پسند کی سگریٹ خود اپنے ہاتھ سے نکال لیتے۔

قرض ادھار کی بھی اس دوکان پر عجیب نوعیت تھی۔ پان سگریٹ لے لیے۔ جی چاہا تو کہہ دیا ”ماں پیسے نہیں ہیں“ اور ماں نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا ”مانگے کس نے

تھے۔" اور نہ جی چاہا تو بغیر بتائے ہی چل دیے اور بعد میں جب ہوئے دے دیے۔

وہ بالکل اکیلی تھی۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔ اولاد کوئی ہوئی نہیں۔ رشتے ناطے داروں میں کوئی تھا ہی نہیں۔ سب جانے کب کے مرکھپ گئے تھے۔ دوکان میں جو کچھ بکری ہوتی اس میں سے آٹھ دس آنے اپنے خرچ کے لیے نکال لیتی اور باقی کا پان، کتھا، چھالیہ اور سگریٹ لے آتی۔ بیوگی، مفلسی اور بے سہارا ہونے کے عام غموں کے علاوہ اور کوئی خاص غم نہ تھا لیکن اس وقت اسے اپنی لاچارگی کا احساس جس طرح ہو رہا تھا ویسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ "مجھ ایسی رانڈ بیوہ کی عزت ہی کیا۔" اس نے سوچا اور ایک ٹھنڈی سانس لی "اور جو کچھ تھی بھی وہ آج اس تراہے پر لٹ گئی۔" اور شاید وہ انہی خیالوں میں گم تھی کہ مسٹر چٹرجی نکل گئے اور وہ انہیں دیکھ بھی نہ سکی، ورنہ اس نے سوچا تھا کہ ان کے پیروں پر گر پڑے گی اور رو رو کے کہے گی، "بھیا فٹ پاتھ سے کیا، چاہے لکھنؤ شہر ہی سے نکال دو، پر پولو کو ایک بار میرے پاس بھیج دو میں اسے اپنے سینے سے چمٹا کر ذرا چوم تو لوں۔"

لیکن اب یہ موقع نکل چکا تھا۔

اسے پولو سے بے حد محبت تھی۔ جب بھی بازار جاتی دو ایک پیسہ کی انگریزی مٹھائی اس کے لیے ضرور لے آتی اور تقریباً چھ ماہ اِدھر ایک دن جب اسے معلوم ہوا کہ کل پولو کی سالگرہ ہے تو وہ اپنا پیٹ کاٹ کے اس کے لیے آٹھ آنے کا ایک کھلونا بھی لے آئی تھی۔ سالگرہ کے دن دوستوں اور رشتہ داروں نے پولو کو جو ڈھیر سارے تحفے دیے تھے ان کے درمیان اس کی اس معمولی سی گڑیا کی بھلا کیا قیمت تھی پھر بھی اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا اور جب پولو بن سنور کر کمرہ سے نکلا تھا تو اس نے مہمانوں کی موجودگی کا خیال کیے بغیر اس کو گود میں لے کر چوم لیا تھا اور اس کے بائیں گال پر یہ کہہ کر "بھگوان میری نظر سے بچائے۔" ذرا سا کاجل بھی لگا دیا تھا۔

لیکن یہ سب تو آج دوپہر والے واقعہ سے پہلے کی باتیں تھیں۔

آج بھی پولو روزانہ کی طرح کھیلا کھیلتا جب اس کے پاس آیا تو اس نے اپنی میلی کچیلی

دھوتی کے ایک کونے سے انگریزی مٹھائی کھول کر اس کے ہاتھ میں رکھ دی، پولو تھوڑی دیر اس کے پاس کھیلتا رہا۔ اس کے بعد واپس چلا گیا۔ تقریباً دو گھنٹہ بعد مسٹر چٹرجی کے بڑے لڑکے نے اس سے پوچھا کہ پولو اٹھنی تو یہاں نہیں چھوڑ گیا ہے اور اس نے گردن جھکائے جھکائے ہی جواب دے دیا، ''نہیں بیٹا، یہاں تو پولو کچھ نہیں چھوڑ گیا۔'' یہ کہہ کر اس نے آس پاس جہاں پولو کھیل رہا تھا ایک نظر ڈالی، لیکن وہاں اٹھنی تو دور کی بات ایک دمڑی بھی نہ تھی۔ اس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی لیکن تھوڑی دیر بعد مسٹر چٹرجی خود اس کے پاس آئے اور انھوں نے بھی وہی سوال دہرایا۔ ''نہیں بھیا۔'' اس نے جواب دیا ''للو بھیا بھی پوچھ رہے تھے۔ یہاں تو پولو جب آیا تو اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔'' اس نے کہا اور ایک بار پھر چاروں طرف نظر دوڑائی۔

''لیکن پولو تو کہتا ہے ماں کو اٹھنی دی ہے۔'' مسٹر چٹرجی نے بے مروتی سے کہا۔

''نہیں بھیا ہمیں تو نہیں دی، گھر ہی میں دیکھو، وہیں کہیں ہوگی۔''

''وہاں تو کہیں نہیں ہے۔''

''تو میں نے پولو سے لے کر رکھ لی؟'' ماں نے یہ بات ذرا غصہ اور غصہ سے زیادہ اس اعتماد کے سہارے جس کی مضبوط ڈور پولو کے ذریعے اس کے اور اس گھر کے درمیان بندھی ہوئی تھی کہا اور اپنے حساب سے بات ختم کر دی۔

لیکن مسٹر چٹرجی اس وقت ٹال جانے کے موڈ میں نہ تھے۔ دس بارہ سال کی جان پہچان اور ساری مروت کا اس وقت انھوں نے کچھ بھی خیال نہ کیا اور روکھا سا منہ بنا کر بولے، ''تم نے نہیں، میں نے لی ہے، یہی کہنا چاہتی ہو۔ ایک اٹھنی کے لیے جھوٹ بولتے تمہیں برا نہیں معلوم ہوتا۔''

یہ سن کر ماں کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

''بلاؤ پولو کو۔'' اس نے غصہ میں کہا۔

ڈھائی سالہ پولو بلایا گیا۔ اس نے بھی بڑھیا کی طرف اشارہ کر کے اپنی تتلی زبان میں کہا

”ماں کو دی ہے۔“

اب تو مسٹر چٹرجی کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس وقت انہیں اگر آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں اور اپنی حیثیت کا خیال نہ ہوتا تو وہ شاید اس کی چھوٹی موٹی خوانچہ نما دوکان اٹھا کر پھینک دیتے اور دو تین لاتیں جما کر اسے بنگلہ کے سامنے کے فٹ پاتھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہٹا دیتے۔ اس نے اپنی لکڑی کی چھوٹی موٹی گولک الٹ دی۔ بیڑی سگریٹ کے سارے ڈبے زمین پر پھینک دیے اور روتی ہوئی بولی ”بھیا خوب تلاشی لے لو، ایک ایک چیز دیکھ لو، پولو کی اٹھنی میں نے لی ہو تو میرے انگ انگ میں کیڑے پڑیں۔“ پر مسٹر چٹرجی مطمئن نہ ہوئے ”کمینی عورت،“ انھوں نے دل ہی دل میں سوچا، وقت بے وقت جب بھی ضرورت پڑی اس کی مدد کی، جب تب کھانا بھی گھر سے بھیج دیا جاتا ہے اور اس سب کا اس نے یہ بدلا دیا ہے۔ آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے کمینگی کی۔“

مسٹر چٹرجی کا اچھا خاصا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ آج موسم کتنا خوشگوار تھا، انھوں نے بیوی بچوں سمیت میٹنی شو دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ بچوں کو لے جا کر جاڑے کے دنوں میں رات کا شو دیکھنا ممکن ہی نہیں ہوتا، اس لیے وہ یونیورسٹی سے ذرا جلد ہی لوٹ آئے تھے لیکن افسوس اس کمینی بڑھیا نے ان کا سارا پروگرام چوپٹ کر دیا تھا۔ یہ سوچتے سوچتے ان کا غصہ اتنا بڑھ گیا کہ لفظ ”کمینی“ ان کہ مُنہ سے نکل ہی گیا، اگرچہ جسے سن کر بڑھیا نے آنسو پونچھتے ہوئے ایک بار پھر ان کی طرف دیکھا، تو وہ آنکھوں میں نفرت اور حقارت لیے وہاں سے چلے گئے۔

اندر جا کر وہ اپنی بیوی پر بگڑنے لگے۔ ایسا لگتا تھا جیسے بڑھیا کو ڈانٹنے پھٹکارنے سے ابھی ان کی پوری طرح تشفی نہیں ہوئی ہے۔ بولے، ”میں نے کتنی بار کہا کہ ایسے ویسے لوگوں کو گھر میں گھسنے نہ دیا کرو۔ جس سے ذرا سیدھے منہ بات کر لو وہی سر پر چڑھ آتا ہے۔ نیچ لوگ چاہے خود کو کتنا ہی شریف ظاہر کرنے کی کوشش کریں نیچ ہی رہتے ہیں۔“ انھوں نے کہا۔

مسٹر چٹرجی نے جو اب تک برا بھلا کہنے میں اپنے شوہر سے ایک ہاتھ آگے ہی تھیں جب خود کو بھی لپیٹ میں آتے دیکھا تو بولیں، ”کب منع کیا تھا آپ نے کہ اندر نہ آنے دیا

کروں۔ مجھے تو خود اس عورت سے نفرت تھی۔ اتنی بوڑھی ہوگئی ہے پھر بھی ایسے دبے پاؤں چلتی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی۔ پولو جب بیمار تھا تو اس کے سرہانے ایسی خاموشی سے آکر کھڑی ہوگئی تھی کہ اسے آتے ہوئے نہ میں نے دیکھا تھا نہ آپ نے۔ چھی چھی۔ ایسی سانپ کی چال چلنے والوں کو ہرگز گھر میں نہ آنے دینا چاہیے۔ میری تو عقل ہی ماری گئی تھی ورنہ پہلے ہی منع کر دیتی تو اچھا ہوتا۔"

پہلے تو مسٹر چٹرجی کو اپنی بیوی پر بے حد غصہ تھا اور ان کے پیشانی کے اوپر کے بال کھڑے ہونے لگے تھے لیکن جب انھوں نے بیوی کو اپنی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے دیکھا تو ان کا سارا غصہ کافور ہوگیا اور بولے "خیر جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان دس بارہ برسوں میں گھر سے جتنی پیالیاں، طشتریاں، کنگھے غائب ہوئے ہیں سب یہی چڑیل لے گئی ہے۔ ورنہ بھلا اور کون لے جائے گا۔ ابھی اس دن میری میز پر سے ایک روپیہ غائب ہوا تھا تو مجھے فوراً شبہ اسی بڑھیا پر ہوا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ سن سفید بال بھلا اس عمر میں ایک روپیہ کی چوری کیا کرے گی۔ مگر جس عورت کی نیت اٹھنی پر خراب ہو سکتی ہے۔ ایک روپیہ تو اس کے لیے بڑی بات ہوئی۔"

"وہ روپیہ تو۔" مسز چٹرجی کی زبان سے سچائی بس نکلنے ہی والی تھی، لیکن پھر مصلحت نے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلنے دیا۔ اس دن بھاجی ترکاری منگانے کے لیے ان کے پاس ٹوٹا روپیہ نہ تھا اور دس روپے کا نوٹ نئے نوکر کو دینا انھوں نے مناسب نہ سمجھا تھا اس لیے شوہر کی میز پر سے ایک روپیہ کا نوٹ اٹھا کر اسے دے دیا تھا۔ بعد میں وہ شوہر سے کہنا بھول گئی تھیں اور انھوں نے پوچھا بھی نہ تھا ورنہ انہیں یاد آجاتا۔ اب اس وقت جذبات کا رخ بڑھیا کے خلاف تھا سو انھوں نے اس کی ایمانداری کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے سے کسی کو روکنا مناسب نہ سمجھا۔ ویسے یہ بات کسی اور نے کہی ہوتی تو شاید مسز چٹرجی خاموش نہ رہتیں لیکن بڑی محنت سے انھوں نے اپنے شوہر کے غصہ کا دھارا اپنے بجائے دوبارہ بڑھیا کی طرف موڑا تھا اور ایک سچی بات کہہ کر وہ اپنے سارے کیے دھرے پر پانی پھیرنا نہیں چاہتی تھیں۔

وہ چور تو ہے ہی۔ انھوں نے اپنے دل کو تسلی دی۔ اگر یہ روپیہ اس نے نہیں لیا تو نہ جانے کتنی اکنیاں، دونیاں اور چونیاں اس نے ضرور چرائی ہوں گی۔ اس لیے وہ بولیں، ”مجھے تو اسے دیکھ ہی کے گھن آتی ہے۔ جھبرے جھبرے بال، میلے کپڑے۔ اور آنکھیں کیسے مٹکاتی ہے، سیدھے سادے ڈھنگ سے بات کرنا تو اسے آتا ہی نہیں۔“ مسز چٹرجی نے اس کے آنکھ مٹکانے کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

وہ تو یہ سلسلہ جانے کب تک جاری رہتا لیکن اتفاق سے مسٹر چٹرجی کے ایک دوست کی بیوی آگئیں اور سب لوگ ان سے بات چیت میں لگ گئے۔ ان کے دو بچوں کے ساتھ گھر کے بچے کھیلنے لگے اور مسٹر چٹرجی اور ان کی بیوی مہمان سے گپ بازی کرنے لگے۔ تھوڑی دیر پہلے کے واقعہ سے ذہن پر جو بوجھ سا چھا گیا تھا اس کی تہیں ایک ایک کر کے اترنے لگیں اور دس پندرہ منٹ بعد انھیں یہ واقعہ شعوری سطح پر یاد بھی نہ رہ گیا۔ اس کے باوجود پکچر کا پروگرام ختم ہو جانے کی وجہ سے ذہن پر تھوڑا سا بوجھ اور ماحول میں بدمزگی کا ہلکا سا تناؤ اب بھی باقی تھا۔ پھر بھی مہمانوں نے آ کر اچھا خاصا دلچسپی کا سامان کر دیا تھا۔

ذرا سی دیر بعد نوکر چائے بنا کر لے آیا۔ مہمانوں کی وجہ سے کچھ خاص اہتمام تھا، دو تین طرح کے بسکٹ، نمکین اور مٹھائی بھی چائے کے ساتھ میز پر لگا دیے گئے تھے۔ پولو تو مٹھائی کا عاشق ہے ہی، جوتے پہنے پہنے صوفہ پر چڑھ گیا تو صوفہ کے کور پر اس کے نئے جوتوں کا ایسا نشان بن گیا کہ جوتا بنانے والی کمپنی کا نام بھی پڑھا جا سکتا تھا۔ مسٹر چٹرجی نے ایک ہاتھ سے وہ نشان صاف کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے پولو کو نیچے اتار دیا۔ پولو نے رونے کے لیے منہ بنایا ہی تھا کہ انھوں نے ایک رس گلہ اس کے منہ میں رکھ دیا اور اس کے روہانسے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”جوتے پہن کر صوفے پر نہیں چڑھتے، صوفہ گندا ہو جاتا ہے۔“ انھوں نے پولو کے جوتوں کے فیتے کھولتے ہوئے کہا۔ پہلے بائیں پیر کے جوتے کا فیتہ کھولا پھر دائیں پیر کا۔ وہ نیچے دیکھے بغیر اپنے مہمان سے بات چیت بھی کر رہے تھے اور جوتا بھی اتارتے جا رہے

تھے۔ پولو اس انتظار میں کہ کب جلدی سے جوتا اتر چکے، نیچے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ جوں ہی اس کے دونوں جوتے اتار دیے گئے، اس نے شرارت سے ایک جوتے پر زور سے لات ماری اور ”چھن“ کی آواز کے ساتھ ایک سفید سفید گول سکہ پکے فرش پر گر پڑا۔ یہ وہی اٹھنی تھی جس نے سارا بکھیڑا کھڑا کیا تھا۔

میاں بیوی نے ایک دوسرے کو خاموش نگاہوں سے دیکھا لیکن دونوں ایک دوسرے کی نظروں کی تاب زیادہ دیر تک نہ لا سکے اور انھوں نے خود کو مہمان سے بات چیت میں کھو دینا چاہا۔ لیکن اب ان باتوں میں نہ تو انہیں کوئی دلچسپی تھی، نہ کوئی تسلسل۔ ایسا لگتا تھا جیسے بس کوئی قرض ادا کیا جا رہا ہو۔

چائے ختم ہونے کے بعد ہی مسٹر چٹرجی یونیورسٹی میں ایک جلسہ کا بہانہ بنا کر چلے گئے۔ باہر جاتے ہوئے انھوں نے کنکھیوں سے اس بڑھیا کو دیکھا اور اسے کسی کام میں مشغول پا کر چپکے سے آگے بڑھ گئے۔

رات کو میاں بیوی نے مشورہ کرنے کے بعد اگلے دن بڑھیا کو کہلا بھیجا کہ خیر اب تو معاف کر دیا لیکن آئندہ سے کوئی ایسی غلطی نہ کرنا۔

یہ پیغام سن کر بڑھیا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک لکیر دوڑ گئی۔ اور وہ اسی شام اپنی چھوٹی موٹی دوکان اٹھا کر کہیں چلی گئی۔

◆ ◆

میرے بعد

دالان میں لاش پر کسی نے سفید چادر ڈال دی تھی، باہر صحن میں مردوں کی بھیڑ تھی اور اندر عورتوں کی۔ مکان کے باہری اور اندرونی حصہ کو ملانے والے دروازہ سے ہر لمحہ رونی صورت بنائے کوئی برآمد ہوتا، باہر سے کوئی اندر آتا۔ اندر کچھ پردے دار عورتیں تھیں اس لیے دروازہ بند کر دیا گیا تھا لیکن اس آمد و رفت کی وجہ سے کواڑ کے پٹ زیادہ دیر تک بند نہ رہ پاتے اور جب کسی کو خیال آتا پٹ بھیڑ دیے جاتے لیکن پھر وہی ہوتا، دروازہ پاٹوں پاٹ کھل جاتا۔

ایک بار پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ پھر کھلا۔

‘‘جبار صاحب ذرا سنیے۔’’ ایک آواز آئی اور پھر ایک تیس بتیس برس کا شخص دروازہ سے برآمد ہوا۔ دونوں نے صحن کے ایک کونے میں دھیرے دھیرے کچھ باتیں کیں۔

غیر متوازن طریقہ سے ہلتے ہونٹ، ٹوٹے پھوٹے جملے، چند آوازیں۔

پھر چند منٹ بعد باہر کے کمرہ میں فہرست تیار کی جا رہی تھی۔ لوبان، اگربتی دو بنڈل، کفن کا کپڑا، سلائی کے لیے درزی سے کہنا اور ہاں، دو پلکیں اوپر اٹھیں اور دوسری آنکھوں سے مل گئیں۔

‘‘ناؤن بھی تو بلائی جائے گی۔’’

‘‘ہاں اس کا بھی انتظام کر لیا جائے۔’’ ایک تیسری آواز آئی۔

شام ہوئی، رات ہونے میں دیر نہ لگی، پھر ‘‘رات گئے’’ ہونے میں دیر نہ لگی، پھر تین بجے

کسی نے آہستہ سے زنجیر کھٹکھٹائی۔ دروازہ کھولا گیا، ایک بوڑھی عورت اندر داخل ہوئی۔

"بھیا ذرا دیر ہو گئی، آنکھ نہیں کھلی۔"

دروازہ کھولنے والا کچھ نہ بولا۔

"بیر کی پتیاں منگا لی تھیں، پانی گرم ہو گیا"؟

"سب کچھ ہو چکا ہے۔" اس بار اس نے جواب دیا۔

پھر صبح ہوتے ہوتے اندر لاش نہلائی جانے لگی تو وہ بچے جو اس ماں کی گود میں زندگی پا کر اتنے بڑے ہوئے تھے، پڑوس کے مکان میں بھیج دیے گئے تاکہ ان کے ذہنوں پر برا اثر نہ پڑے۔ سارے گھر میں موت کا سناٹا چھا گیا۔ مکمل خاموشی۔ ہچکی کی ایک آواز نہ ابھری۔ مرنے والی کی روح کو تکلیف ہوگی، اس کی روح بھٹک رہی ہوگی، اپنی ایک ایک چیز کو دیکھ رہی ہوگی، کوئی نہ روئے، نہ آنسو بہائے۔

سب نے اپنے اپنے آنسو پی لیے۔ یا اللہ تو نے اپنے بندوں کو ضبط کا کیسا المناک یارا دے رکھا ہے۔ کبھی کبھی تیزی سے پانی بہنے کی "چھل چھل" اور دیگ سے ڈونگا ٹکرانے کی آواز آتی یا پھر پاندان کھلنے اور چھالیہ کترنے کی آواز۔

اب لاش کو آخری پوشاک پہنا دی گئی۔ بچوں کو بلا کر ماں کی صورت آخری بار دکھائی گئی۔

"کیسا نور برس رہا ہے چہرہ پر۔" کسی نے کہا۔

"سیدھی جنت میں جائے گی۔"

دوسری آواز ابھری اور پان کی گلوری منہ کے اندر سرک گئی۔ کچھ دیر انگلیاں پاندان بند کرنے کی کوشش کرتی رہیں، پھر پاندان کھسکا دیا گیا۔ ایک جسم پلنگ سے دالان کے کھمبے تک گیا اور تین فٹ لمبی خون کی لکیر اوپر سے نیچے تک بن گئی۔ اب وہ آسانی سے بات کر سکتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد۔۔۔۔

"دروازہ چھوٹا ہے، پلنگ باہر کیسے نکلے گا۔"

"پھر۔"

"کوئی چھوٹا پلنگ نہیں ہے۔"

یہ سب الگ الگ آوازیں تھیں۔ اسی درمیان فٹا آگیا۔ سبھی بڑے چھوٹے پلنگ ناپ لیے گئے۔ سوال اپنی جگہ قائم تھا، خاموش، بے زبان، لیکن جواب کے انتظار میں۔

"دو چادروں میں کیوں نہ لے جایا جائے باہر تک۔"

"پلنگ میں گہوارا لگ گیا؟"

"لگ گیا۔"

چند مرد گھر میں داخل ہوئے۔ آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ایک پلنگ پر دو چادریں بچھا دی گئیں۔ لاش ان چادروں پر رکھ دی گئی۔ ان چادروں نے جسم کو سہارا دیا اور جسم یوں اٹھ گیا جیسے جانے کے لیے تیار ہی بیٹھا ہو۔ درمیان میں رشتہ کے چھوٹے بھائی کے ہاتھ تھے اور اِدھر اُدھر گھر کے بڑے بوڑھے۔ لاش اندر کے دالان سے ہو کر صحن میں پہنچی۔

"ٹھہرو۔"

لاش کے دل میں خون کے ایک قطرے نے جو جم گیا تھا ایک کروٹ لی۔

"ذرا مجھے اوپر والا کمرہ تو دیکھ لینے دو جہاں تم نے پہلے پہل اظہارِ محبت کیا تھا اور جہاں میں نے شادی کی پہلی رات گزاری تھی۔ صحن کے بائیں کونے میں جو رات کی رانی ہے، اب کے جاڑوں میں پھولے تو پھولوں کا ایک گچھا میرے سرہانے رکھ آنا اور ہاں اللہ دیکھو کل میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، تمہارا کمرہ ٹھیک نہ کر سکی، تمہارا پتلون بھی نہ دھو سکی۔ معاف کر دینا۔"

لاش کو سنبھالنے کے لیے دو ہاتھ ذرا سے کھسکے تو گال کے پاس کا گوشت جو ابھی پوری طرح منجمد نہیں ہوا تھا ذرا سا ہلا اور دو لب ہلے، ایک بار کھلے اور پھر آہستہ سے بند ہو گئے، جیسے

زندگی میں پہلے بوسے کے بعد کھلے لب بند ہو جاتے ہیں، آنسو کا ایک قطرہ لاش کی آنکھ سے ٹپکا اور کفن پر چھڑکے ہوئے عرقِ گلاب میں مل گیا۔

’’میں تمہیں کتنا پیار کرتی تھی، سچ زندگی بھر کبھی نہ کہہ سکی۔ جب تم شام کے وقت سفید شفاف کپڑے پہن کر میرے اوپر والے کمرہ میں آ کر بیٹھ جاتے تھے تو شام کا دھندلکا کچھ کم ہو جاتا تھا۔ جب سورج کی کرنیں تمہارے ہلکے سنہرے اور خوب صورت بالوں پر پڑتیں تب تم کتنے اچھے لگتے تھے۔ میں نے کتنی بار سوچا تھا کہ یہ بات تم سے کہوں لیکن کہہ نہ سکی تھی۔ میں کل پھر آؤں گی، اسی جگہ، اسی کمرہ میں۔ لیکن تم آج مجھے اس طرح کیوں لے جا رہے ہو؟‘‘

’’ابھی سات آٹھ سال پہلے ہی کی تو بات ہے کہ تم مجھے بیاہ کر لائے تھے۔ گود میں اٹھا کر کمرہ کے اندر لے گئے تھے اور تم نے ایک بار میرے ہاتھ میں چٹکی بھی تو بھری تھی، کیا کہا چٹکی میں نے ہی پہلے کاٹی تھی۔‘‘

اور شوہر نے محسوس کیا کہ نازک ہاتھوں کی دو ملائم انگلیوں نے ناخنوں کو ذرا زور دے کر ایک ہلکی سی چٹکی لے لی۔

’’لیکن آج تم مجھے اس طرح کیوں لیے جا رہے ہو۔ کیا میں اتنی بھاری ہو گئی ہوں کہ چار چار آدمی مجھے گٹھری کی طرح اٹھا کر لے جائیں۔‘‘

’’میں تمہیں کبھی نہ چھوڑوں گی۔ ہر شام تمہارے پاس آیا کروں گی۔ ہم دونوں اس کمرہ کو کبھی نہ چھوڑیں گے۔ میں تمہیں کتنا پیار کرتی ہوں، تمہیں کیسے بتاؤں۔‘‘

لاش کے ہونٹ آخری بار کھلے، ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور دونوں گالوں پر ہلکی سی قوس بنی اور جب لاش باہر چارپائی پر لٹائی گئی تو ہونٹ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔ ذہن نے آخری بار سوچا۔ میری آواز خود میرے ہی گھر میں صدا بصحرا ہو جائے گی، یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

قبر تیار تھی، ایک سفید ریش بزرگ نے اپنی آستینیں چڑھا لیں۔ پائنچے چڑھا لیے اور قبر میں تر گئے۔ اندر دو ایک کنکر رہ گئے تھے، نکال کر پھینک دیے گئے۔

''کیوڑے کی بوتل۔''

بوتل دے دی گئی۔

کارک کھول کر پوری بوتل قبر میں الٹ دی گئی۔ خوشبو کا ایک جھونکا آیا لیکن موت کی اپنی بو کے ساتھ مل کر بے اثر ہو گیا۔

لاش قبر کے اندر اتار دی گئی۔ پھر سب نے مٹی دی۔

''جلدی سے فاتحہ پڑھ لیا جائے، پانی گھرا ہے۔'' کسی نے کہا اور سارے ہاتھ جیسے ایک ساتھ اٹھ گئے۔ سب نے فاتحہ پڑھا۔ کسی نے پڑھا۔ کسی نے صرف لب ہلائے اور کوئی اس قابل نہ تھا کہ لب ہلا سکے۔

واپسی قریب کے راستے سے ہوئی۔ ریل کی پٹریوں کے برابر برابر چل کر۔ چند کے پاس سائکلیں تھیں۔ پٹریوں کے دونوں طرف لگے ہوئے تاروں پر سے سائکل پھنداتے ہوئے ایک سائکل کا پیڈل تار میں پھنس گیا۔

''سائکل نہیں لانی چاہئے تھی۔'' بات چھوٹی۔

''ایسے موقعہ پر سائکل ہر گز نہیں لانی چاہئے۔'' ایک صاحب نے اپنے تجربہ کی روشنی میں کہا۔

ایک بار خاموشی کا بند ٹوٹا تو پھر بات چل نکلی: ''صاحب میرے یہاں بھی ایک ایسی ہی ٹریجڈی ہو گئی تھی۔''

کچھ لوگ کٹ کر دوسری طرف نکل گئے تھے۔ گھر جلدی واپس پہنچنا تھا۔ جن کو دفتر جانا تھا، قدم تیز تیز بڑھا رہے تھے۔ اب صرف آٹھ دس آدمی رہ گئے تھے۔ یہ سب بکھرے بکھرے چل رہے تھے۔ جو سب سے آگے تھا اس کے بعد والے نے سگریٹ سلگائی۔ دوسرے نے اپنی جیب ٹٹولی اور تھوڑی دیر بعد پانچ سگریٹیں جل رہی تھیں۔

زیادہ تر عورتیں اپنے اپنے گھر جا چکی تھیں۔ محلہ کے ایک صاحب کے یہاں سے بڑے بڑے خوانوں میں رکھ کر چائے آئی۔ گرم گرم چائے اور مکھن لگے توس۔

"بٹیا نے کہا ہے جتنے لوگ ہیں چائے پی لیں۔" نوکر نے کہا اور چائے دانیاں اور پیالیاں میز پر رکھ دیں۔

"اب یہاں چائے کون پیے گا۔"

"بٹیا نے کہا ہے چائے پلائے بغیر نہ آنا۔"

چند لمحوں کی خاموشی، دور دور کوئی آواز نہیں۔ پھر کسی نے چائے دانی پر سے ٹی کوزی اٹھائی، چمچے میں شکر لی، کیتلی کا ڈھکنا کھولا اور اب کیتلی میں چمچے کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ ٹک ٹک کھٹک۔۔۔ آواز کسی قدر تیز اور صاف تھی۔ کیتلی میں چمچہ روز ہی اسی طرح چلایا جاتا ہے لیکن کسی نے یہ آواز جو اتنی صاف اور واضح تھی اس سے قبل کاہے کو سنی ہوگی۔ پھر چائے بنائی گئی۔ ایک، دو، چار کپ، چھ آدمی تھے۔ پیالیاں بڑھائی گئیں۔

"پپو، تم بھی پیو۔" ایک صاحب نے گھر کے ایک فرد سے کہا۔ اس نے مرحومہ کے شوہر کی طرف پیالی بڑھائی۔

شوہر نے انکار کیا۔

"تم نہ پیوگے تو ہم سب بھی نہیں پئیں گے،" کسی نے باقی سارے لوگوں کی طرف سے جو ابھی قبرستان سے واپس آئے تھے۔ شوہر سے کہا۔

ایک صاحب نے لمبا سا کش لیا تو راکھ چاندنی پر گر گئی۔ اس نے بڑی صفائی سے راکھ اٹھا کر ایش ٹرے میں ڈال دی۔ فرش پر جل بجھنے والی راکھ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

شوہر نے چائے کی پیالی اٹھائی۔

اب چھ انگلیاں پیالیوں کے کنڈوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ ہر شخص نے چائے پینے کا جواز تلاش کر لیا تھا۔

■■

بفاتن

بفاتن قسم پاک پروردگار کی کھا کر کہتی کہ اس نے رات گئے ماجد میاں کے کمرے سے ملے ہوئے دالان سے سفید شفاف، دودھ ایسے کپڑے پہنے، ایک بزرگ کو کئی بار نکلتے دیکھا تھا۔

خالہ امی پانی کی ٹنکی کے پاس ثمر بہشت کے درخت کے نیچے چھوٹی سی چوکی پر جانماز بچھائے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعا مانگا کرتیں، ”رحم کیجیو پروردگار اس گھر پر، غلطی انجانے میں ہوگئی تھی اور اس کی بہت بڑی سزا بھگت چکی ہوں، اس گھر کے چراغوں کو روشن رکھیو۔“ ایک تو خالہ امی کا کورے لٹھے ایسا سفید رنگ، اس پر جب صاف شفاف کپڑے پہن کر وہ دوپٹہ اپنے ہاتھوں پر پھیلا لیتیں تو بالکل فرشتہ ہی معلوم ہوتیں۔ دعا مانگتے مانگتے جب وہ ”من الجنة والناس“ پر پہنچتیں تو ان کی نظریں غیر ارادی طور پر سامنے والے دالان کی طرف اٹھ جاتیں، پھر وہ چوکی کے کونہ پر رکھا ہوا نقیش کٹورا اٹھاتیں، زیرلب کچھ پڑھ پڑھ کر اس پر دم کرتیں اور پھر جزدان میں لپٹے ہوئے سپارہ سے اسے ڈھک دیتیں۔ اب ہم لوگوں کی باری آتی۔ ہم لوگ نہایت سعادت مندی سے لائن لگا کر کھڑے ہو جاتے، سب سے آگے ایاز، اس کے بعد میں، اور میرے بعد رشیدہ خالہ امی اپنے دودھ ایسے شفاف ہاتھ ہمارے چہروں پر پھیرتیں، سر سے لے کر سینہ تک پھونک ڈالتیں، دم کیا ہوا تھوڑا پانی پلاتیں اور دعائیں دیتے ہوئے ہم تینوں کو رخصت کر دیتیں۔

”اپنے بیٹے کو کتی، دیر تک پھونکتی رہیں۔“ میں ایاز کو چڑھاتی۔

”اور دم کیا ہوا پانی بھی خوب بہت سا پلاتی ہیں۔“ رشیدہ کہتی۔

''اور ایاز ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم، چپ چاپ کھڑا کھڑا ہم دونوں کی جملہ بازی سنا کرتا جیسے اسے ہماری ان باتوں سے کوئی غرض ہی نہ ہو۔ پھر جونہی ہم دونوں کی توجہ کسی اور طرف ہوتی وہ ایک دھپ رسید کر کے چمپت ہو جاتا۔ خالہ امی مسکرا کر ہماری طرف دیکھتیں اور تسبیح کے دانے گننے میں مشغول ہو جاتیں۔

''تجھے جن صاحب سمجھیں۔'' رشیدہ اپنے نزدیک سب سے بری بد دعا دیتی۔

''ہوں۔۔۔'' خالہ امی ہم لوگوں کی طرف زہر آلود نظروں سے دیکھتیں، اور ہم لوگ ان کی نظروں کے سامنے ہٹ کر ایاز کو خوب کوستے کاٹتے۔

خالہ امی اس قدر عبادت کرتی تھیں کہ بس کیا کہوں، پوری پوری لمبی لمبی آیتیں، نہ جانے کیسے کیسے وظیفے، دعائے گنج العرش، سب ان کو زبانی یاد تھے۔ پھر جب سورج تین بالشت اوپر چڑھ جاتا اور دھوپ نعمت خانہ سے کھسک کر لکڑیوں کے پاس آجاتی تو خالہ امی جانماز پلٹ کر اٹھتیں، آنگن کے چاروں کونوں پر کچھ پڑھ کر دم کرتیں اور پھر دالان کے پاس والی کھڑکی میں منہ ڈال کر جو تحصیلدار صاحب کے یہاں کھلتی تھیں، پکارتیں۔

''بہو! اے بہو کیا کر رہی ہو۔''

''جنس نکال لوں، ابھی آئی۔'' بہو مہین آواز میں جواب دیتیں۔

اور تھوڑی دیر بعد بہو آجاتیں، پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہتیں، اور اس دوران بھی 'ہوں، ہاں' کرتے کرتے خالہ امی عجیب پراسرار نظروں سے سامنے والے دالان کی طرف ایک آدھ بار دیکھ لیتیں۔ پھر وہ کہتیں۔۔۔۔۔

''اسے بفاتن نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔۔ صاف شفاف کپڑے، نورانی صورت۔'' اور بہو کا سر عقیدت سے جھک جاتا۔

''اور نور کا عالم تو دیکھو۔ سچ کہتی ہوں اس دالان اور کمرہ میں کوئی تین سال ادھر سفیدی کرائی تھی اور آج بھی ایسی ہی آب و تاب ہے جیسے کل ہی کرائی ہو اور اس دالان کو لے لو۔'' خالہ امی دوسرے دالان کی طرف اشارہ کر کے کہتیں ''ابھی شب برات میں ہی قلعی کرائی تھی پر

ایسا لگتا ہے جیسے کاٹے کھا رہا ہے۔ میں تو پہلے ان باتوں کو مانتی نہیں تھی پر دو باتیں ایسی ہو گئیں کہ ایمان لانا ہی پڑا۔“

اور قبل اس کے کہ تحصیل دار صاحب کی دوسری بیوی جو ہمارے ملحق مکان میں کرایہ دار تھیں اور خالہ امی کی بالکل ساس کی طرف عزت کرتی تھیں کچھ سوال کریں، وہ خود ہی کہتیں۔

”بفاتن کو اس گھر میں آئے تین اوپر دس سال ہو گئے۔ اس نے تو آتے ہی کہہ دیا تھا کہ ہو نہ ہو یہاں کوئی بزرگ ہیں ضرور، پر مجھ نگوڑی، مت کی ماری نے اس کان سنا اس کان اڑا دیا۔“

خالہ امی ایک بار دالان کی طرف دیکھتیں۔

”اور میں تو مان بھی جاتی، پر وہ، اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، بڑے صاف گو تھے اور ان باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے۔ میں نے جب ان سے بزرگ کی بات کہی تو ہنس کر بولے۔ ”تمہاری بفاتن تو بڑی پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ارے ایسی اللہ والی سے گھر کا کام لیتی ہو۔“

یہ کہتے کہتے خالہ امی کے چہرے پر ایک غمگین مسکراہٹ پھیل جاتی۔

”پھر ایک دن بولے۔“ وہ خالو ابا کے بارے میں کہتیں ”ہاں ایک بزرگ رہتے تو ہیں۔ میں تو بہت دنوں سے جانتا ہوں، پر ہیں بڑے جید اور غصور۔ اگر ایک بار کسی سے خفا ہو جائیں تو بس سات پیڑھیوں تک خاندان تباہ ہو جائے۔“

”اور آپ تو کہتی تھیں۔“ تحصیلدار صاحب کی بیوی خالہ امی کا جملہ پورا ہونے کا انتظار بھی نہ کرتیں۔

”لو وہ تو بالکل تمہارے سامنے ہی کھڑے ہیں، واللہ کیا نورانی صورت پائی ہے، بالکل فرشتوں جیسی، خالہ امی بات پوری کرتیں۔“

اب خالہ امی کی مسکراہٹ جس میں اداسی پہلے ہی سے شامل ہوتی بالکل ختم ہو جاتی، سفید بھوؤں کے نیچے چمکتی ہوئی آنکھوں کے کناروں پر آنسوؤں کے دو قطرے نمودار

ہوتے اور وہ دوپٹہ کے کونے سے انہیں پونچھ ڈالتیں۔

’’یا اللہ بخشش تو بس تیرے کرم پر ہے، ویسے نماز روزہ کے پابند تو نہ تھے پر جیتے جی کسی سے جھڑک کے بات نہ کی، محلہ یا دفتر میں کسی سے لڑائی نہیں ہوئی، بالا دین چپراسی تک گھر آتا تو اس سے آپ آپ کر کے بات کرتے۔‘‘ اب خالہ امی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ چکی ہوتی۔

آنسو جب ذرا تھمتے تو وہ کہتیں۔

’’پہلے پہل جب بفاتن نے کہا تو میں نے ہنس کے ٹال دیا، اس پر بفاتن بولی کہ اگر بزرگ سچے ہوں گے، آپ ہی ثابت ہو جائیں گے۔ ایک نہ ایک دن ضرور خواب دیں گے اور پھر تین روز بعد ایک رات میں نے انہیں خواب میں دیکھ ہی لیا۔ پر بہو یہ تو خواب کی باتیں تھیں، ایک دن تو میں نے جاگتے میں دیکھا، اپنی آنکھوں سے‘‘ خالہ امی کہتیں، ’’کسی کام سے اس دالان میں گئی، کمرہ کا دروازہ کھولا، چراغ لے کر اندر گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ جانماز بچھی ہے، لوبان سلگ رہا ہے، خوشبو سے سارا کمرہ معطر ہے۔‘‘

وہ تھوڑی دیر کے بعد دالان کی طرف دیکھتی جاتیں اور کہتیں۔

’’اور بہو ایسا لگتا جیسے نور برس رہا ہو نور، ہو کا عالم پر خاموشی ایسی کہ اٹھنے کو جی ہی نہ چاہے، اب وہاں برسوں سے کوئی گیا ہی نہ تھا، پھر بھلا لوبان کون سلگاتا، جانماز کون بچھاتا، خواب کی بات ہوتی تو جھوٹ مان بھی لیتی پر اپنی آنکھوں سے دیکھے پر بھلا کوئی شک کر سکتا ہے اور اس رات تو بفاتن نے ان بزرگ کو اپنی آنکھوں سے باہر نکلتے دیکھا۔‘‘

’’یہ بیمار پڑی تو‘‘ خالہ امی میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہتیں، ’’بس میں نے شام کو گڑگڑا کے انہیں کے توسط سے خدا سے دعا مانگی،‘‘ دودھ بھرا پیالہ کمرہ میں رکھوا دیا اور کہاں تو بخار اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا اور کہاں اگلی صبح جو آنکھ کھلی تو بھلی چنگی۔ دوا حکیم سب بیکار، میں تو مان گئی، مولا کا کرم، بزرگوں کی کرامات کے بغیر مجال نہیں جو پرندہ پر مار سکے۔‘‘

’’اور بیماری کیا تھی۔‘‘ بہو پوچھتیں۔

"اے بیماری کیا، میں منع کرتی تھی، اس طرف پیر کر کے نہ سوئیو، کبھی بستر پر بیٹھی ہو تو نہ اٹھائیو، پر یہ مانتی ہی نہ تھی۔ لحاف کے نیچے لیٹی تھی، یہ آکے دھم سے بیٹھ گئی، غرا کے بھاگی تو میں نے سر پیٹ لیا، تھوڑی ہی دیر بعد بلبلا کے بخار چڑھ آیا۔"

خالہ امی ان بزرگ کی کرامات اور ان کے جلال کے بارے میں جانے کتنے قصے سنایا کرتیں اور ان قصوں کا سلسلہ خالو ابا کی موت پر آکے ختم ہوتا۔ خالو ابا کو بلیوں سے خدا واسطے کا بیر تھا، جہاں بلی دیکھی، بل بل شروع کر دیتے۔ اور وہ کالی بلی تو ان کو ایک آنکھ نہ بھاتی۔ دو سال ادھر گرمی کے دن تھے، دفتر سے جلے بھنے آئے تھے، اس دن کچھ غصہ میں بھی معلوم ہوتے تھے۔ صراحی سے پانی انڈیلنے کے لیے منہ موڑا ہی تھا کہ بلی خالہ نے گوشت کی پلیٹ میں منہ ڈال دیا، خالو ابا نے ہاتھ کا گلاس کھینچ کر مارا جو سر پر لگا اور بلی خالہ وہی لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ شام ہوتے ہوتے خالو ابا کو بخار چڑھا، دوا دی گئی پر کچھ اثر نہ ہوا، ڈاکٹروں کا تو خیال تھا کہ سخت لو لگ گئی ہے۔ بفاتن اور خالہ امی کہتیں یہ سب جن بزرگ کے جلال کا نتیجہ ہے۔ خالہ امی نے بارہ یتیموں کو کھانا کھلانے اور اکیس روزے رکھنے کی منت مانی۔ پر کسی کی آئی بھلا ٹلی ہے۔ صبح چار بجے خالو ابا سدھار گئے۔

اس واقعہ کے بعد سے یہ روزانہ کا معمول ہو گیا کہ پاو بھر بالائی دار گاڑھا دودھ ایک صاف پیالہ میں انڈیل کر روزانہ کمرہ میں رکھ دیا جاتا اور صبح پیالہ صاف ملتا۔ چینی کی پرچ اسی طرح پیالہ پر ڈھکی رہتی اور دودھ کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرتا۔ رمضان کے دنوں میں تو خالہ امی تھوڑی سی شکر ڈال کر لچھے بھی بھگو دیتیں اور دودھ پاو بھر سے آدھا سیر آدھ سیر کے بجائے کر دیتیں، نماز پڑھنے کے بعد وہ دونوں بچوں کی اور میری سلامتی کی دعائیں مانگتیں اور دعا مانگتے مانگتے "من الجنۃ والناس" تک آتے آتے ان کی نظریں آپ ہی آپ دالان کی طرف اٹھ جاتیں۔

لیکن ایک ہفتہ قبل یہ سب ختم ہو گیا تھا، دالان کے اندر کا پڑا ہوا کوڑا کرکٹ نکال کر

باہر پھینک دیا گیا تھا اور وہ چوکی جس پر بفاتن نے ان بزرگ کو نماز پڑھتے دیکھا تھا آنگن میں ایک کنارے کھڑی ہوئی تھی اور گھر کا کام کرنے کے لیے بفاتن کی جگہ پر ایک دوسری نوکرانی رکھ لی گئی تھی۔

آٹھ دس دن ادھر ایک رات خالہ امی کی آنکھ جو کھلی تو دالان کے اندر کمرہ میں مدھم مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ جل تو جلال تو پڑھتی وہ دالان میں پہنچیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ کمرہ میں لوبان سلگ رہا ہے، موم بتی روشن ہے، پاس ہی دیا سلائی پڑی ہے اور بفاتن کھڑی غٹ غٹ دودھ چڑھا رہی ہے۔

■ ■

سچے جھوٹے موتی

چکّر دار دروازے سے پارک کے بیچ میں لان تک دونوں طرف جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان جھنڈیوں کے بیچ کہیں کہیں غبارے بھی لٹک رہے تھے، رنگین اور خوبصورت غبارے۔ پارک کے ایک کونہ میں کچھ بچے گیند بلا کھیل رہے تھے۔ دوسری طرف محلّے کے چھوٹے بچوں کی ریس ہو رہی تھی۔ ان بچوں نے اپنے جوتوں سے ایک سیدھی لائن بنا دی تھی۔ اسی جگہ سے دوڑ کر سامنے مہندی کی جھاڑی کو سب سے پہلے چھونے والا فرسٹ آتا۔ لیکن مہندی کی جھاڑی کو کس نے سب سے پہلے چھوا، اس بارے میں ہر بار جھگڑا ہوتا۔ ”واہ جی واہ! خوب رہی! پہلے ہم نے چھوا اور چلے ہیں بڑے آپ فرسٹ آنے والے۔“ پارو جس نے شان سے کمر تک اپنا دوپٹہ آڑا باندھ رکھا تھا، ایاز کی طرف غصہ سے دیکھ کر کہتی اور ایاز بھی اپنی بات پر اڑا رہتا۔ لیکن تھوڑی دیر میں ہی بھولے بھالے بچوں میں سمجھوتا ہو جاتا اور پھر دوڑ شروع ہو جاتی۔

یہ پارک جو اَب کافی خوبصورت اور ہرا بھرا ہو گیا تھا، کچھ دنوں پہلے تک یوں ہی سا تھا۔ پر نئے مالی کے آنے کے بعد اس کی صورت ہی بدل گئی تھی۔ اب پگڈنڈیوں کے دونوں طرف سدا بہار کے پودے بھی لگ گئے تھے اور بچوں کو جو پہلے آزادی سے کیاریاں خراب کیا کرتے تھے، روکا ٹوکا بھی جاتا تھا۔ نئے مالی کا بس چلتا تو آج بھی پارک میں اتنی بھیڑ کی اجازت نہ دیتا۔ لیکن اس کا بس چلتا جب نا!

لان کے اس حصہ پر جہاں بچے گیند بلا کھیل رہے تھے، کسی نے ایک میز لا کر رکھ دی،

پھر اس پر ایک خوبصورت سا میز پوش ڈال دیا گیا۔ کچھ بچے کرسیاں لے آئے اور پھر کسی نے کھجور کے پیڑ پر چڑھ کر لاؤڈ اسپیکر لگا دیا۔ ریکارڈنگ شروع ہو گئی۔ ''میرا لال دوپٹہ ململ کا۔'' ''زندگی بھر نہیں بھولے گی یہ برسات کی رات۔'' ریکارڈنگ شروع ہوئی تھی کہ بچے کھیل کود چھوڑ کر جمع ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد چگر دار دروازے کی طرف سے ایک صاحب کئی لوگوں کے ساتھ آئے اور ریکارڈنگ بند کر دی گئی۔ اس بھیڑ میں سے کچھ بچے ایک ساتھ نمودار ہوئے اور انھوں نے مل کر گایا۔ ''جن من گن!'' سب کھڑے ہو گئے، پھر سب بچوں نے تالیاں بجائیں اور مہمانِ خصوصی نے ایک چھوٹا سا بھاشن دیا، بچوں میں انگریزی مٹھائی بانٹی گئی اور فلمی گانوں کی ریکارڈنگ پھر شروع ہو گئی۔ ''چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو۔''

پارک سے لگے مکان کے اوپری حصہ سے آٹھ نو سال کی ایک لڑکی لال پھولدار اسکرٹ پہنے زینے سے دھیرے دھیرے اُتری۔ بارش ابھی ابھی ہو کر کھل گئی تھی، تیز ہوا کا جھونکا آیا، تو اس کی اسکرٹ کا دامن پھڑ پھڑایا، لہرایا، اور پھر وہ خود لہرائی۔

''چچا!'' اس نے بڑے چاؤ سے کہا۔

''ہاں!'' چچا جو نیچے کمرے میں اکیلے ہی رہتے تھے، انھوں نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر ہی جواب دیا۔ ''کیا ہے؟''

''چچا آپ آزادی نہیں منا رہے ہیں!''

''منا تو رہا ہوں۔''

''واہ! آپ نے خوب اچھے کپڑے پہنے ہی نہیں۔''

اب چچا نے کتاب سرہانے رکھ دی اور نکہت پروین کی طرف جسے سب پیار سے 'پارو' کہتے تھے دیکھا اور مسکرا کر بولے۔ ''تمہارے ایسے رنگین کپڑے تو میرے پاس ہیں نہیں۔''

پھر ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد چچا نے کہا، ''کہاں جانے کی تیاری ہے. بھئی یہ ربن ہمیں دے دو۔''

''اسکول!'' پارو نے جملے کے دوسرے حصے کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا، اور اپنے بنفشی رنگ کے ربن کو جس پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت پھول بنے ہوئے تھے، انگلی کے گرد لپیٹنے لگی۔ پھر اس نے دونوں ٹانگیں اُٹھا کر سامنے والی نیچی سی میز پر رکھ دیں، اور بولی، ''چچا، آپ نے بتایا نہیں۔''

''کیا نہیں بتایا؟''

''آپ سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟؛''

''ہاں! اچھا کل بتاؤں گا۔''

''نہیں! ابھی بتائیے۔ آپ ہمیشہ ٹال جاتے ہیں۔''

''اور اگر پانی برس گیا تو اسکول کیسے جاؤ گی؟'' چچا نے پارو کی توجہ دوسری طرف منتقل کرنے کی کوشش کی۔

''سمجھ گئی، سمجھ گئی!'' پارو نے زور سے تالی بجائی۔ ''آپ مجھے ٹال رہے ہیں، بتائیے آپ سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟''

''اچھا کل ضرور بتاؤں گا۔''

''تو کل تک میں بھی سگریٹ پیوں گی۔'' پارو نے اپنی ٹانگیں میز کے نیچے کر لیں اور سامنے رکھی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا سے ایک سگریٹ نکالی۔

''پارو!'' چچا نے بناوٹی غصہ سے کہا۔

''تو آپ بتاتے کیوں نہیں؟''

''دیکھو پارو اصل میں بچے سگریٹ نہیں پیتے۔''

چچا نے یہ جملہ دھیرے دھیرے رُک رُک کر کہا تا کہ پارو اس کے بعد کوئی اور سوال

نہ کر بیٹھے۔ اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ انھوں نے اپنے حساب سے بات ختم کر دی ہے، سرہانے رکھی ہوئی کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پارو بھلا ماننے والی تھی۔

بولی، ''تو اب میں بچہ کہاں ہوں؟''

چچا، پارو کے اس جواب سے تھوڑے سے جھنجھلا گئے، لیکن جلد ہی انھوں نے اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پالیا اور بولے، ''لڑکیاں نہیں پیتیں۔''

''کیوں نہیں پیتیں؟''

''تیری کیوں کا کوئی جواب نہیں — بس نہیں پیتیں۔''

''میں تو ضرور سگریٹ پیوں گی۔ چچا میں ضرور پیوں گی، ہم سب برابر ہیں۔''

جملے کے آخری حصے پر چچا چونک پڑے۔ یہ بات پارو کے منھ سے کچھ عجیب سی لگ رہی تھی، لیکن جوں ہی ان کی سمجھ میں آگیا کہ پارو نے یہ جملہ کس جگہ سے اُٹھا کر اپنی زبان پر رکھ لیا تھا، ان کا سارا تعجب ختم ہو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے پارک میں کی جانے والی تقریر کا یہ جملہ پارو نے اپنے مطلب کے لیے استعمال کر لیا تھا، لیکن اس دلیل کا جواب کیا تھا، اس کی کاٹ کیا تھی؟ کوئی ایسی ہی بات کہنی چاہیے جو پارو کی سمجھ میں آجائے اور تلوار کی سی تیزی سے اس کی دلیل کو بھی کاٹ دے، آخر بولے، ''اچھا تو نہ ہم تمہارے چچا اور نہ تو ہماری بھتیجی۔''

''کیوں؟'' پارو حیران تھی کہ اس کی بات کا یہ نتیجہ کہاں سے نکل آیا۔

''اور کیا؟ جب ہم تم سب برابر ہیں تو تم ہماری بھتیجی کیسے ہوئیں؟''

پارو چکرا گئی۔ پھر بولی، ''یہ بات ہے چچا! میں سب سمجھتی ہوں، آپ عید پر ہمیں موٹر خرید کر دینے سے بچنا چاہتے ہیں...۔ سچ چچا! اب کی آپ نے موٹر خرید کر نہیں دی تو میں امتحان بالکل پاس نہیں کروں گی، جان بوجھ کر فیل ہو جاؤں گی، کتنے دنوں سے ٹال رہے ہیں۔''

ابھی پارو کچھ اور کہنے کے لیے مُنہ کھول ہی رہی تھی کہ ایک دم بارش ہونے لگی۔ صبح ہلکے چھینٹے پڑے تھے جس سے سردی چمک اُٹھی تھی۔ پھر آسمان ذرا کھل گیا تھا، لیکن تھوڑی ہی

دیر کے بعد بادل گھر آئے، اور اب تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور پانی کا چھینٹا کمرے کے اندر تک آ گیا، چچا نے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور بجلی جلا دی۔

"پارو بٹیا— پارو بٹیا۔" باہر سے بچوں کو اسکول کے جانے والی عورت کی آواز آئی۔

"آئی بوا!" پارو نے جواب دیا۔

پارو مشکل سے کرسی پر سے اُٹھی ہی تھی کہ وہ کمرے سے زینے میں کھلنے والے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ پانی میں تقریباً شرابور!

"کیسے اسکول چلو گی، بھیگ جاؤ گی بٹیا!"

"نہیں، میں تو جاؤں گی۔" پارو ٹھنٹھنائی۔

"بھیگ جاؤ گی پارو!" چچا نے ذرا پیار سے کہا۔

"نہیں چچا میں ضرور جاؤں گی، اسکول میں جھنڈا لہرایا جائے گا۔"

جھنڈا پارک میں تو لہرا لیا اور مٹھائی بھی کھا لی، چچا نے بہلانے کی کوشش کی۔

"نہیں چچا، اسکول میں وہ جو گانا گایا جائے گا نہ!" پارو نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے۔

"سارے جہاں سے اچھا— وہ مجھی کو گانا ہے۔"

"پارو اسکول مت جاؤ، بھیگ جاؤ گی۔" زینے کے پاس سے پارو کی ماں نے کہا۔

"ابھی بخار سے اُٹھی ہو، پھر پڑ رہو گی۔"

"ارشد صاحب روکیے —" پارو کی ماں نے اب چچا کو مخاطب کیا۔ "نہیں تو بیمار پڑی تو آپ ہی کے کمرے میں ڈال دوں گی۔ سارا لکھنا پڑھنا دھرا رہ جائے گا۔"

پارو نے منھ بنایا، منمنائی، کسمسائی۔ پھر زور سے پیر زمین پر مار کر بولی۔ "اب اسکول نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی، کبھی نہیں جاؤں گی۔" تھوڑی دیر تک پارو چچا کے کمرے میں کھڑی منھ بسورتی رہی، پھر چپ چاپ اوپر کوٹھے پر چلی گئی۔ چچا نے کتاب اُٹھائی اور پڑھتے پڑھتے نہ جانے کب اُن کی آنکھ لگ گئی۔ قریب دو گھنٹہ بعد جب اُن کی آنکھ کھلی تو آسمان

صاف ہو چکا تھا اور باہر سورج چمک رہا تھا۔ اوپر زینہ پر سے کوئی زور زور سے اُتر رہا تھا۔ شاید اسی آواز سے ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔

''پارو۔'' آواز آئی۔ ''تم اسکول نہیں گئیں۔''

یہ پولو کی آواز تھی۔

گلی کے کنارے نکڑ پر ایک ہلکے سرمئی رنگ کی کار کھڑی تھی، پولو اسی کار سے اُترا تھا۔ نیلا پُل اوور نیلی پینٹ پہنے پولو تیز قدم بڑھاتا ہوا چلا آرہا تھا۔ دو چار قدم چلنے کے بعد وہ اپنے سر کو اس طرح جھٹکا دیتا کہ پیشانی کے بال پیچھے جا گرتے۔ جب وہ قریب آیا تو پارو نے پوچھا۔

''اسکول گئے تھے؟'

''ہاں خوب مزا آیا، خوب کھیل ہوئے، تم نہیں گئیں؟''

''ممی نے جانے ہی نہیں دیا، بارش ہو رہی تھی نا؟''

''تو تم بھی کار کیوں نہیں خرید لیتیں؟'' پولو نے کہا۔

''ابو کہتے ہیں آج کل موٹریں آ ہی نہیں رہی ہیں۔'' پارو اسی زینے پر کھڑی اپنی فراک کے دامن کو انگلیوں سے مروڑتی ہوئی بولی۔

''میں دلوا دوں۔ جتنی کہو۔ تمہارے ابو نے بہانہ بنا دیا ہوگا۔'' پولو نے کہا۔ ''میرے ڈیڈی تو کہہ رہے تھے یہ کار بیچ کر نئی ماڈل خرید لیں گے۔''

''اچھا کھیلنے نہیں آؤ گے؟''

''نہیں آج ہم لوگ سینما دیکھنے جا رہے ہیں۔ تم نہیں گئیں۔ سینما دیکھنے؟'' پولو نے کہا اور اپنے مکان میں داخل ہو گیا۔

پارو اب زینہ سے اُتر کر پارک کے جنگلے کے پاس کھڑی ہوگئی اور میدان میں کھیلنے والے بچوں کو دیکھنے لگی۔ پھر ایک طرف سے نجمہ، سلمیٰ اور عذرا آگئیں۔ تینوں اس کے ساتھ ہی

اسکول میں پڑھتی تھیں۔

نجمہ نے پوچھا۔ ”تم اسکول نہیں گئیں پارو؟“

”نہیں پانی جو برس رہا تھا۔“ پارو نے منھ بنا کر کہا۔

”اور ہم بھی نہیں گئے۔“ عذرا بولی۔ ”کون جاتا کیچڑ میں۔ محلہ سے تو کوئی نہیں گیا۔ بوا کہہ رہی تھیں۔ سیتا، شیلا، رشیدہ کوئی نہیں جا رہا ہے۔“

”اور ایسے پانی میں مزا بھی کیا آیا ہوگا۔“ نجمہ نے کہا۔

”پولو تو کہہ رہا تھا کہ اس کے اسکول میں خوب کھیل ہوئے۔“ پارو نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

”کھیل کیا خاک ہوئے ہوں گے، پانی تو برس رہا تھا۔“ سلمیٰ بولی۔

”پولو ہی کہہ رہا تھا۔“ پارو نے اپنے خیال سے بات ختم کر دی۔

”شیخی بگھار رہا ہوگا۔“ نجمہ بولی۔ ”ٹائی باندھ کر کیسا اکڑ اکڑ کے چلتا ہے، صبح میں نے کہا، آؤ کوڑا جمال شاہی کھیلیں تو بولا ”مجھے اسکول جانا ہے۔“ پھر بولا ”میرے پاس تو کار ہے، کوئی پیدل تھوڑے۔۔۔ ہی جانا ہے۔“ ہم نے بھیا اس سے کٹی کر لی۔“

اتنے میں پولو کپڑے بدل کر مکان سے باہر نکلا۔ نجمہ، سلمیٰ وغیرہ کو دیکھ کر مسکرایا۔

”آؤ نجمہ کوڑا جمال شاہی کھیلیں۔“

”نہیں بھیا، ہم نہیں کھیلیں گے۔“ نجمہ نے بے رخی سے جواب دیا۔

”تم تو سنیما دیکھنے جا رہے تھے۔“ پارو نے پوچھا۔

”سوچا ٹال جائیں۔“ پولو نے اپنے جوتے کی ٹو سے زمین کریدتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔ ”پارو تم نے میرا Present دیکھا۔ انکل نے پیرس سے بھیجا ہے۔ پورا کا پورا مکان ہے۔ جب دروازہ کھولو تو ایسے مزے کی آواز آتی ہے۔۔۔ ٹن ٹن ٹن ٹن۔

”ہم نہیں دیکھتے۔“ نجمہ نے کہا۔ ”ہم اپنا کھیل کھیلنے جا رہے ہیں۔“

''مت دیکھو۔'' پولو نے جواب دیا اور پارک کی طرف چل دیا۔

''دیکھا تم نے شیخی ماری تھی کہ سینما دیکھنے جا رہا ہوں۔ کیسا شیخی خورا ہے۔'' نجمہ بولی۔

''بھیا، ہم تو اب نہیں بولیں گے — پارو تم بھی نہ بولنا۔ سب مل کر کٹی کر لیں، اور جو بولے اس سے بھی کٹی۔''

آخر پارو بھی جو تھوڑی دیر سے خاموش تھی، بول اُٹھی۔ ''بڑے آئے موٹر والے، ان کی موٹر انھیں کو مبارک۔''

نجمہ نے پارک کی طرف جاتے ہوئے پولو کو غصہ بھری نظروں سے دیکھا اور کہا، ''کیسا بن بن کے چل رہا ہے۔ اللہ کرے، اس کی موٹر ٹکرا جائے، ساری شیخی نکل جائے۔''

''پارو!'' چچا نے جو کمرہ سے بچوں کی باتیں سن رہے تھے، آواز دی۔ اور سب بچے اُڑن چھو ہو گئے۔ اور پارو چپ چاپ زینے کا دروازہ کھول کر اندر کمرہ میں جا کھڑی ہوئی۔

''جی چچا۔''

''پارو۔'' چچا نے غصے سے کہا۔ پھر ایک دم خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد بولے۔ ''جاؤ، کھیلو۔''

ان تر و تازہ کلیوں میں ایسے زہریلے خیالات کے احساسات نے انہیں بے زبان کر دیا تھا۔

■ ■

نیا سفر

مولا بخش نے سر اُٹھا کر دیکھا تو بختیار سامنے کھڑا تھا۔ ہٹا کٹا جسم، چھوٹی چھوٹی تراشی ہوئی مونچھیں، بھرے بھرے گال، خاکی کپڑوں میں ملبوس۔ بختیار اِن چار برسوں میں بالکل بدل گیا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیسے مولا بخش نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔

چار سال ادھر بختیار گھر والوں سے روٹھ کر چلا گیا تھا — اور ماں باپ اسے رو پیٹ کر کب کے صبر کر چکے تھے۔

بختیار کی عادتیں گھر والوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں، ایک ہی ٹولی میں صبح سے شام تک گھومنے کے بعد جہاں اس کے ساتھی دو دو روپے کی ریزگاری پیٹ لاتے، اس کے پیسے بمشکل دس بارہ آنے سے بڑھ پاتے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ دن بھر کے بعد صرف سات آٹھ آنے لے کر ہی لوٹتا۔ برس تیرہ کا سن، بھیگتی مسیں، کھلتے ہاتھ پیر، یہی زمانہ تھا جب اسے راہ پر لگایا جا سکتا تھا۔ اس وقت ذرا بھی ڈھیل دی تو پھر گیا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے۔ یہ سوچ کر ایک دن مولا بخش نے اس سے کہا۔

''بیٹا یوں تو کام چلنے سے رہا۔ اب میرا کیا، کب ہوں کب نہیں۔'' یہ کہہ کر مولا بخش ایک لمحہ کے لیے رُک گیا۔ اس نے کندھے پر پڑے ہوئے میلے رومال سے ہاتھ پونچھا اور بولا۔

''اگر میری آنکھ بند ہوگئی تو اس سائبان کا کرایہ بھی ادا نہ کر پائے گا — ایک روپیہ روز تو کرایہ ہی چلا جاتا ہے اور تو دس بارہ آنے سے اوپر لا ہی نہیں پاتا۔''

''تو بابا میں کیا کروں، مجھ سے ریلے پیلے میں دھکے نہیں کھائے جاتے۔'' بختیار نے آج

نہ جانے کیسے، جواب دینے کی جرأت کی۔

"ریلے پیلے میں دھکّے نہیں کھائے جاتے تو کسی راجہ نواب کے گھر پیدا ہوا ہوتا، مولا بخش کے گھر کس لیے پیدا ہوا— تیری عمر کا جب میں تھا،" مولا بخش نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ٹوٹی ہوئی چارپائی کی ادوائن پر سے دوسرا ہاتھ اُٹھاتے ہوئے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"مگر اس وقت کا کیا؟ ٹھاٹھ سے میاں کے پورہ میں رہتے تھے، نہ کہیں جانا، نہ کہیں آنا، نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا، گاؤں کے لوگ خود آ کر گھر پر اتا (اتنا) دے جاتے کہ خرچتے نہ بنتا۔"

میاں کے پورہ میں یہ خاندان کئی پشتوں سے رہ رہا تھا۔ مولا بخش کے باپ کریم بخش اور دادا امداد بخش نے اپنی زندگی "چپ شاہ" کے مزار پر گزار دی تھی، اور "کریم بخش کا گنڈہ" تو اتنا مشہور تھا کہ لوگ دور دور سے آتے اور دامن اُمید بھرے جاتے۔ کسی کو مرگی کے دورے پڑتے ہوں یا تپ ہو، مقدمہ ہو یا فصل کو پالا مار جائے، ان کا گنڈہ ہر مرض، ہر مصیبت دور کر دیتا، اور گنڈہ بھی کیا، سفید تاگے کے دو گولے، سوا پاؤ ریوڑی، نیاز کے سوا پانچ آنے، سوا گز کورا کپڑا، اور اللہ اللہ خیر صلاّ — اس سے زیادہ ایک پیسہ نہ لیتے۔ کوئی لاکھ روپے بھی ڈال دے تو شاہ صاحب نظر اُٹھا کر نہ دیکھتے۔ کریم بخش نے اپنے لڑکے کی شادی کی تو پاس پڑوس کے گاؤں میں دھوم مچ گئی۔ سینکڑوں مریدوں نے تحفے پیش کیے، نیازیں گزاریں، آس پاس کے بڑے زمینداروں اور ساہوکاروں سے لے کر فرشتوں تک نے شرکت کی۔

پھر زمانہ کچھ ایسا بدلا کہ مولا بخش کو یہ آبائی پیشہ خیرباد کہنا پڑا۔ فسادات کی آگ دیہات تک پہنچ گئی اور اُس آگ سے مولا بخش ایسا خدا رسیدہ بزرگ تک نہ بچ سکا۔ یہ لُٹا لٹایا قافلہ، ماں باپ اور بیٹے پر مشتمل تھا— لکھنؤ پہنچا تو روٹی کپڑے تک کا کوئی سہارا نہ تھا۔ نہ ڈھب کے تن پر کپڑے تھے، نہ پاس میں کچھ ایسی نقدی۔ ایسی بھاگم بھاگ مچی کہ توبہ ہی بھلی۔ پیر مارو کہیں تو پڑے کہیں۔ وہ تو خدا کا کرنا کچھ ایسا تھا کہ واسکٹ میں دس دس کے چار نوٹ سلے تھے ورنہ فاقوں کی نوبت آ جاتی۔

مولا بخش نے سوچا کہ کسی بزرگ کی قبر مل جائے تو ان کی کرامت سے بگڑے دن بن جائیں۔ بارے گومتی کے کنارے ایک مزار ملا، کسی نے ایک سفید چادر لا کر قبر پر چڑھا دی، صبح

سے شام تک لوبان بھی سلگنے لگا۔ دن ڈھلے پھولوں کے دو گجرے بھی پڑ جاتے اور مولا بخش خدا سے لو لگائے خاموش بیٹھے رہتے، لیکن ہفتہ بھر کی یہ ریاضت بیکار گئی، نہ ایک بے مراد آیا، نہ کسی نے نذر نیاز چڑھائی۔

کسی نہ کسی طرح مولا بخش کی ملاقات چودھری سے ہوگئی۔ شہر کے فقیروں میں کوئی دنگا فساد ہوتا، یا کوئی ایک دوسرے کے بازار، علاقہ میں بھانجی مارتا تو مقدمہ چودھری ہی کے سامنے پیش ہوتا۔ چودھری نے اس کے حال پر رحم کھایا اور ان لوگوں کو اس کے تین سائبانوں میں سے ایک سائبان کے کونے میں پاؤں پھیلانے بھر کو ذرا سی جگہ مل گئی۔ ویسے ان دِنوں بازار کچھ اس قدر مندا تھا کہ فقیر کسی نئے آدمی کو اپنی ٹولی میں لینے پر تیار نہیں تھے، لیکن چودھری کے حکم کے آگے بھلا کس کی مجال تھی جو پر مارے۔

یہ نیا کام مولا بخش کو ذرا نہ بھاتا، پر مرتا کیا نہ کرتا، صبح سے شام تک دوڑے دوڑے پھرتا تب جا کر کہیں پیٹ بھرنے بھر کے پیسے مل پاتے اور پھر بازار اور علاقے بھی طے۔ اس سے ایک قدم باہر نکالا تو دوسرے فقیر مارنے مرنے پر تیار۔ لیکن کچھ دنوں میں سب ٹھیک ٹھاک ہوگیا۔ میاں بیوی دو، ڈھائی روپے پیٹ ہی لیتے۔ بختیار بھی آٹھ دس آنے لے ہی آتا۔ جمعہ، جمعرات کو کچھ زیادہ ہاتھ لگ جاتا۔ بدن عادی تھا خوش پوشی کا، پر چار چھے دنوں ہی میں وہ پرانی خوبو ہوا ہوگئی۔ اب نہ ہاتھ بڑھاتے شرم آتی، نہ یہ خیال ہی ہوتا کہ کہیں کوئی جان پہچان والا نہ مل جائے۔

بختیار پر اس ڈانٹ پھٹکار کا خاطر خواہ اثر ہوا، اب وہ صبح سویرے نکل جاتا اور شام کو لوٹ کر آتا تو روپے ڈیڑھ روپے کی ریزگاری نیفے میں کھرسی ہوتی، سائبان کے اس کونے میں اب چہل پہل ذرا زیادہ نظر آتی۔ باپ دن رات دُعائیں دیتا، ماں بلائیں لیتی، بیٹا سپوت نکلا تھا، ہونہار برو کے چکنے چکنے پات، اگر یہی حالت رہی تو وہ دن دور نہ تھا جب بختیار اس پیشے میں ماہر ہوجائے گا اور پھر۔۔۔۔

لیکن ایک دن مولا بخش نے بختیار کو عجیب حالت میں دیکھا۔ خاندانی عزت کا جنازہ

بختیار کے کندھوں پر اُٹھ رہا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ملیں۔ غور سے دیکھا کہ کہیں اسے دھوکہ تو نہیں ہو رہا ہے، لیکن اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ نظروں کے سامنے اس کا "سپوت" ہی تھا جس سے ماں باپ کو بڑی اُمیدیں تھیں۔ مولا بخش کا بیٹا اور مزدوری کرے، اس سے زیادہ شرم کی بات بھلا اور کیا ہو سکتی تھی۔ چار پشتوں سے کسی نے سامان اُٹھانا تو دور کی بات محنت مزدوری سے ایک پیسہ بھی نہ کمایا تھا، پر اس نے تو خاندان کی ناک ہی کٹوا دی۔ لیکن اس وقت وہ صرف اس لیے چپ رہ گیا کہ دوسرے فقیر بھی ساتھ تھے، اگر ان کو پتہ لگ گیا تو بڑی سبکی ہوگی مگر شام کو جب بختیار گھر لوٹ کر آیا تو مولا بخش نے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

"اگر یہی لچھن رہے تو کوئی خاندان کا نام لینے والا نہ رہ جائے گا" مولا بخش نے غمگین لہجہ میں کہا۔ "خدا کا ادبار ہے ہم لوگوں پر، ورنہ خدا بخش کے خاندان میں کوئی یوں سامان اُٹھائے اُٹھائے پھرے۔"

"تمھیں ڈیڑھ روپیہ ہی تو چاہیے۔" اس نے جواب دیا۔ "سو میں لا کے دے دیتا ہوں، مجھ سے اس ہٹے کٹے بدن پر بھیک نہیں مانگی جاتی۔ جس کے آگے ہاتھ پھیلاؤ یہی کہتا ہے، موٹے تازے تو ہو محنت کیوں نہیں کرتے۔"

مولا بخش نے خوب سخت سست سنائیں اور وہ خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ وہ باپ کو خفا نہیں کرنا چاہتا تھا، ویسے خود اس نے کئی بار سنجیدگی سے بھیک مانگنے کی کوشش بھی کی تھی، دل کے اندر چھپے ہوئے سینکڑوں فرضی دُکھ دردوں کا چہرہ کو آئینہ دار بنایا تھا، نہ جانے کتنی دُعائیں زبانی یاد کر لی تھیں، کتنی بار اس غرور کو جو بھیک مانگنے میں آڑے آتا تھا اس نے دور دور تک کھدیڑنے کی کوشش کی تھی، پر کسی کی ترچھی نظریں اس سے برداشت نہ ہوتی تھیں – اسی لمحہ اسے چند دن پہلے کا واقعہ یاد آ گیا، جب نانبائی نے اسے موٹا تازہ کہہ کر دکان سے دھتکار دیا تھا، وہ اُٹھا اور خاموشی سے ایک جانب چل دیا تھا۔

ماں باپ نے سوچا بھلا جائے گا کہاں، آ ہی جائے گا۔ لیکن صبح سے شام ہوئی، پھر اگلا دن آیا، پر بختیار لوٹ کے نہ آیا۔ بوڑھے باپ نے کئی بار معمولی سی آہٹ پر بھی اپنی چھوٹی چھوٹی

آنکھیں کھول کر سڑک پر دیکھا، "چپ شاہ" کے حضور دُعا مانگی، پر بختیار کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ اور ماں باپ رو پیٹ صبر کر کے بیٹھ رہے۔

ان چار برسوں میں مولا بخش کی حالت اور بھی خراب ہوگئی تھی۔ اب وہ پہلی سی سکت تھی نہ طاقت جو ریلے پیلے میں آگے بڑھ کر بھیک مانگ پاتا۔ عام طور پر دوکاندار خیر خیرات کے لیے ایک مخصوص رقم نکال رکھتے ہیں، اور جو بھی پہلے پہنچتا ہے لے آتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا جب وہ پہنچتا تو پیسے ختم ہو چکے ہوتے۔

پھر ایک دن بختیار آگیا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے۔ بدن پر گوشت بھی کچھ بڑھ گیا تھا۔ مولا بخش کو پہلے تو جیسے یقین نہ آیا، اس نے آنکھیں مَل مَل کے دیکھا۔ بختیار ہی تھا۔ ماں نے بلائیں لیں، دُعاؤں کا پٹارا کھول دیا۔

بختیار کو دیکھ کر اُمید کی ایک ننھی کرن مولا بخش کے دل میں پیدا ہوئی، ہوسکتا ہے چار سال تک ٹھوکریں کھانے کے سے عقل آگئی ہو، شاید وہ بڑھاپے کی لاٹھی بن جائے۔ لیکن قبل اس کے مولا بخش کچھ کہے بختیار بولا، "بہت دُکھ جھیلے بابا! اب میرے ساتھ چلو، آمدنی تھوڑی ہی ہے، اسی نوے کماتا ہوں، بمبئی میں کیا ہوتا ہے، پھر بھی روکھی سوکھی سب مل کر کھائیں گے۔"

مولا بخش کو بختیار کی یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی لیکن سختی کا نتیجہ وہ دیکھ ہی چکا تھا، اور اب تو بختیار خیر سے کمانے بھی لگا تھا، اس لیے اس نے ذرا نرم لہجہ اختیار کیا۔

"بیٹا! اب اس عمر میں کہاں جاؤں، سنا ہے، میاں کا پورہ میں سب ٹھیک ٹھاک ہوگیا ہے — وہیں چلیں اور شاہ صاحب کے مزار پر زندگی گزار دیں۔ اب میرا کیا، آج ہوں کل نہیں۔ میرے بعد تو ہی اس گدی پر بیٹھے گا۔" بیتے دنوں کی یاد سے مولا بخش کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"بابا مجھ سے نہ ہو سکے گا، دن بھر کام کرتا ہوں، شام کو روکھی سوکھی جو بھی ملتی ہے کھا کے سو رہتا ہوں۔" بختیار اپنی ضد پر قائم تھا۔

مولا بخش نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ان کو بیٹے کی اس بے راہ روی پر بے حد

افسوس تھا۔ دونوں نے اپنی پوری کوشش کر کے دیکھ لی، نہ مولا بخش آبائی پیشہ چھوڑنے پر تیار ہوا، نہ بختیار واپس آنے پر۔

چلچلاتی دھوپ میں مولا بخش بازار کا چکر لگا کے آیا تو اس کی سانس پھول رہی تھی، کپڑے پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ ہاتھ کی چھڑی ایک کنارے کھڑی کر کے سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ بختیار نے موقع غنیمت جانا اور بابا کے پاس کھسک آیا اور جب مولا بخش ذرا پیر سیدھے کرنے کے لیے کھرّی چارپائی پر لیٹ گیا تو وہ اس کے کمزور اور دُبلے پتلے پیر دبانے لگا اور اس نے بڑے پیار سے کہا۔

"بابا چلو نا، مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا، اب تمہاری عمر یوں مارے مارے پھرنے کی ہے، کچھ مجھے بھی کھدمت کرنے کا موقع دو۔"

بختیار کی ماں جلدی سے پانی لے آئی۔ ٹوٹے ہوئے پنکھے سے ہوا جھلنے لگی، پھر آہستہ سے بولی۔

"مان بھی جاؤ میرے لال کی بات۔"

"ہاں بابا! اب چلو میرے ساتھ۔" بختیار نے ماں کی شہ پا کر ایک بار اور زور دیا۔

"نہیں بیٹا، اس عمر میں جانے سے رہا، میاں کا پورہ چلا جاؤں گا، وہاں جیسی بھی روکھی سوکھی ملے گی۔۔۔ کھا کے سو رہوں گا۔" اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

بمبئی جانے سے پہلے بختیار نے بابا سے کہا کہ چلو ایک کرتا، پاجامہ خرید دیں، وہ انکار کرتا ہی رہا کہ آخر اس کی کیا ضرورت ہے۔ اب اپنی گدی پر واپس جا رہے ہیں، وہاں کس چیز کا توڑا، پر بختیار کو نہ ماننا تھا نہ مانا۔ کرتے پاجامے کا کپڑا خریدنے کے بعد واپس آتے ہوئے اسے نانبائی کی وہ دوکان دکھائی دی، جس کے مالک نے اسے ایک بار دھتکار دیا تھا۔ اس کے دل میں اسی نانبائی کی دوکان میں بیٹھ کر کھانا کھانے کی خواہش نے جنم لیا۔ مولا بخش نے مخالفت بھی کی کیونکہ جمعہ کو ایک وقت کا کھانا اسی دوکان سے ملتا تھا لیکن بختیار کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔

مولا بخش نے شلوکہ کی اندر والی جیب سے ایک مڑا مڑایا دو روپے کا نوٹ نکالا۔ بختیار ضد کرتا رہا لیکن اس نے یہ نوٹ نانبائی کے سامنے پھینک دیا۔ اس کے چھوٹے سے جسم میں اس وقت نہ جانے کہاں سے طاقت آ گئی تھی، چہرہ پر جھریوں کی جگہ ایک عجیب قسم کی چمک نے لے لی تھی۔ نانبائی نے ایک بار اوپر سے نیچے تک دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔

”کھانے کے پیسے؟“

”ہاں، ہاں۔“ اس نے فخر سے جواب دیا اور باقی پیسے لے کر چل دیا۔

چند قدم چلنے کے بعد وہ واپس مڑا اور اس نے نانبائی سے پوچھا۔

”کیا یہی کھانا تم فقیروں کو بھی دیتے ہو؟“

”ہاں، یہی۔“ اس نے حیرت سے جواب دیا۔

”یہی کھانا جو تم نے مجھے ابھی دیا تھا؟“ مولا بخش کو یقین نہیں آ رہا تھا؟

”یہی، بالکل یہی۔“ نانبائی جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

”نہیں، بالکل غلط، تم جھوٹ بولتے ہو، یہ کھانا دوسرا ہے — یہ زیادہ مزے دار ہے۔“ اس نے کڑک دار آواز میں کہا، اور اکڑتا ہوا چل دیا۔

اگلے روز، ماں، باپ اور بیٹے پر مشتمل یہ چھوٹا سا قافلہ بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔

دو نقش، ایک تصویر

وہ سائکل کے آگے ہینڈل پر دونوں کتابوں کے تھیلے لٹکائے چلا جا رہا تھا۔ صبح سے دوپہر تک اِدھر اُدھر گھومنے کے باوجود کل تین آنے کے پمفلٹ بک پائے تھے۔ صبح کونسلرس ریزیڈنٹس کی اوپری منزل پر جب وہ سائکل کے دونوں طرف اور پیچھے کیریر پر کتابیں لادے اُن ایم۔ ایل۔ اے کے کمرے میں پہنچا جنھوں نے اسے آج بلالیا تھا تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ آج دیر ہوگئی ہے — پھر کبھی آنا، اور یہ خیال آتے ہی اس نے اپنی ہتھیلی کھول دی۔ ہاتھ کی انگلیوں کے نیچے ہلکے نیلے رنگ کے گھٹے پڑ گئے تھے۔ اس نے سائکل فٹ پاتھ سے لگا کر کھڑی کر دی اور پاس لگے ہوئے نل سے سوکھے بالوں پر پانی ڈالا، منھ پر دو چار چھینٹے مارے اور پھر دیوار کے سائے میں کھڑے ہو کر سستانے لگا — ایسا لگتا تھا جیسے آج کا دن یوں ہی گزر جائے گا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اگر ہائی کورٹ کے بار ایسوسی ایشن جایا جائے تو شاید کچھ کتابیں بک جائیں اور یہ خیال آتے ہی وہ سائکل پر بیٹھ گیا، اور تیزی سے پیڈل مارتا، گرم ہوا کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرتا ہوا آگے بڑھا اور چوراہے سے دائیں طرف مڑ گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد جب وہ بار ایسوسی ایشن سے باہر نکلا تو اس کے تھیلے ہلکے ہوگئے تھے اور اس کی جیب میں سولہ سترہ روپے پڑے تھے۔ اب وہ چار آنے اوپر چار روپے خرچ کر سکتا تھا۔ زمین اتنی ہی گرم تھی، ہوا کے جھکڑ بھی کچھ کم نہ ہوئے تھے، تاہم اسے اس بلا کی گرمی کا احساس کچھ کم سا ہوگیا تھا۔ اسی لمحے اسے اپنی پھٹی ہوئی چپل کا خیال آیا جس کا آدھے کے قریب تلا گھس چکا تھا، اور چلنے میں ایڑی زمین سے لگتی تھی۔ فوراً ہی اس نے سوچا کہ چلنے سے

پہلے پتلون ضرور بدل لینی چاہیے تھی۔ یہ پتلون تو بالکل تھیلا ایسی معلوم ہوتی ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ اگر دو تین روپے میں کوئی معمولی ہی سی چپل ملے تو لے لی جائے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے باقی کتابیں پی پلس بک ہاؤس میں رکھ دیں۔

کتابوں کا یہ کام شروع کیے ہوئے اسے دو تین دن ہوئے تھے۔ کل بارہ سوا بارہ روپے کی کتابیں بکی تھیں، جس سے اسے تین روپے کے قریب مل گئے تھے — ادھر اس نے بڑے سخت دن دیکھے تھے، اکثر تو ایسا ہوا کہ دو دو دن چائے کی ایک پیالی پر بسر ہو گئے۔ دو سال پہلے وہ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلا گیا تھا، یہاں اسے ایک جگہ عیوضی کا کام بھی مل گیا تھا لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ کچھ دنوں تک بچائے ہوئے پیسے ساتھ دیتے رہے۔ پھر یہ پیسے ختم ہو گئے، لیکن آمدنی کا کوئی نیا ذریعہ نہ نکلا۔ نوکری کی تلاش میں اس نے نہ جانے کتنے دفتروں کی خاک چھانی، مارا مارا پھرتا رہا۔ جہاں کوئی جگہ خالی ہوتی فوراً درخواست دے دیتا۔ اسے یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں نوکری مل ہی جائے گی۔ کئی جگہوں سے انٹرویو کے لیے بلاوا بھی آیا، لیکن نتیجہ کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ پھر ایک دن اُسے سکریٹریٹ میں کلرکی کی جگہ کا اشتہار نظر آیا۔ یہ جگہ صرف چند مہینوں کے لیے تھی اور پہلے کا تجربہ شرط تھا۔ اسے تجربہ بھی تھا۔ اس سے قبل سکریٹریٹ میں کام بھی کر چکا تھا۔ اشتہار دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ جگہ اسی کے لیے خالی ہوئی ہے اور اس نے اللہ کا نام لے کر درخواست دے دی۔

سکریٹریٹ میں ایک ذرا سی جگہ کے لیے دس نہ بیس قریب قریب ڈیڑھ سو اُمیدوار موجود تھے — وہ جلد ہی ان سب میں گھل مل گیا۔ سب ایک دوسرے سے اپنے بارے میں بتا رہے تھے، کچھ یہ ظاہر کرتے کہ انھیں اس نوکری کی کوئی ضرورت تھوڑی ہے، بس یوں ہی وقت گزاری کے لیے چلے آئے ہیں کہ چلو یہ بھی ایکٹوٹی ہو جائے۔ کچھ بڑی بڑی سفارشوں کے حوالے دیتے، اور کچھ ان سب کا منھ تکتے۔ جب سامنے کمرے سے چپراسی منھ نکال کر کسی اُمیدوار کو پکارتا تو سب کے چہروں پر ایک عجیب طرح کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ سب

جانے والے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے اور اس وقت تک دیکھتے رہتے، جب تک وہ چق اُٹھا کر اندر داخل نہ ہو جاتا اور کوئی تو چپراسی کے پاس جا کر اس سے نہایت رازدارانہ طریقے سے پوچھتا۔

''اب تک کوئی لیا تو نہیں گیا۔''

اور جب وہ اس بارے میں اپنی لاعلمی ظاہر کرتا تو بڑی بے تکلفی سے کہتا ''کیوں یار ہم سے چھپاتے ہو، ارے تمہیں اور معلوم نہ ہو۔ جو صاحب کے دل میں وہ تمہارے ناخن پر، تم تو گرو مسکراہٹ ہی سے بھانپ لیتے ہو۔'' اور پھر وہ چپراسی اس کے کان کے پاس مُنہ لے جا کے کہتا: ''ابھی تو نہیں لگتا کہ صاحب کو کوئی پسند آیا ہو۔'' تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ جاتی اور قینچی کی ڈبیا سے سگریٹ نکال کر یہ کہتے ہوئے اس کی جیب میں ڈھونس دیتا: ''تم بھی کیا یاد کرو گے۔ کس نواب سے پالا پڑا تھا'' اور چٹکی بجاتا، خوشی سے پیر پٹکتا پھر اسی گروہ میں آملتا۔ اس بھیڑ میں پندرہ بیس ایم۔ اے تھے۔ زیادہ تر گریجویٹ اور کچھ تو ایسے بھی تھے جو وکالت پاس کر چکے تھے۔ ایسے لوگوں کے درمیان اسے عجیب قسم کی کمتری کا احساس ہوتا۔

پھر جب اس کی باری آئی اور وہ اندر داخل ہوا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

بات یہ تھی کہ انٹرویو بڑے بابو لے رہے تھے۔ بڑے بابو جن کا پورا نام دوارکا پرشاد تھا، اُن دنوں اس کے کام سے بہت خوش تھے، جب وہ عیوضی میں یہاں کام کر رہا تھا اور یہ خیال آتے ہی اسے یقین ہو گیا کہ اب تو نوکری مل ہی جائے گی۔ بڑے بابو نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے۔

''احمد! تمہیں نوکری نہیں ملی۔''

''جی نہیں۔''

اس نے نہایت سعادت مندی سے جواب دیا۔

''تم نے کام تو کافی اچھا کیا تھا:'' انھوں نے کہا تو اُسے لگا کہ دوارکا بابو بس اَب خوشخبری

سنانے جا ہی رہے ہیں کہ انھوں نے اسے اس جگہ کے لیے چُن لیا ہے، لیکن دوار کا بابو خاموش تھے۔ اسے ان کی اس وقت کی خاموشی بڑی بری معلوم ہوئی۔ پھر وہ خود ہی تھوڑی دیر کے بعد بولے۔

''میں تم کو ضرور رکھ لیتا لیکن کیا کروں اوپر سے بڑی سفارش آچکی ہے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے رائٹنگ پیڈ کے نیچے سے ایک لفافہ نکالا اور بولے، ''تم سے تو میں نے صاف صاف بتا دیا ہے، ابھی اتنی جو بھیڑ لگی ہے اس میں سے ہر ایک کو بلانا ہے، اُلٹے سیدھے سوال کرنا ہیں، اور پھر سب کو مایوس کر دینا ہے۔'' اور وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ وہ بولا ''تو میں جاتا ہوں۔'' اور باہر چلا گیا۔

جیسے ہی اس نے باہر قدم رکھا، تمام اُمیدواروں نے اُسے گھیر لیا اور طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔

''کیا پوچھا؟''

''کیا ایکسپیرینس ضروری ہے؟''

وہ ایک لمحہ خاموش رہا، پھر ایک دم اس نے نہ جانے کیا سوچا اور مسکرا کر بولا۔

''اب آپ لوگوں کا جانا بے کار ہے۔ میرا اپائنٹمنٹ ہوگیا۔ بڑے بابو نے مجھے بتا دیا ہے۔''

اور یہ سن کر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ جانے کتنوں کے چہرے کی رنگت اُڑ گئی، کچھ کی پیشانی پر پسینہ کی ہلکی ہلکی بوندیں نمودار ہوگئیں۔ اور ان میں سے دو ایک کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے، لیکن پھر کوئی کچھ نہ بولا، کسی نے نہ کچھ پوچھا، اور وہ خاموشی سے چلا گیا۔

پھر ایک دن جب اس کے پاس سگریٹ تک کے لیے پیسے نہیں رہ گئے تھے، اس نے کمرہ کی صفائی کا ارادہ کیا اور اس صفائی میں بہت سے ایسے رسالے ردّی کے ڈھیر میں آگئے جو ابھی پچھلے ہی مہینے اس نے الماری میں سجائے تھے۔ اس کے بعد اس نے الماری

کے نیچے والے خانے پر نظر دوڑائی۔ یہاں کچھ پرانی ناولیں، یونیورسٹی کے نوٹس اور کچھ دوسرے کاغذات تھے۔ اب اس کے لیے یونیورسٹی کے نوٹس کی کیا خاک اہمیت ہو سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے دو ایک کاپیوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ لیا۔ پھر انگریزی کی کاپی اُٹھائی اور یوں ہی بے خیالی میں جلدی جلدی ورق پلٹنے لگا، پلٹتے پلٹتے اس کے ہاتھ رُک گئے اور چہرے پر مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی— بات صرف یہ تھی کہ یونیورسٹی میں پردیب کی تجویز پر ایک بار اس گروپ کے سب لڑکوں نے ایک کاغذ پر اپنی دلی خواہشیں لکھ دی تھیں۔ اور اس وقت وہی کاغذ اس کے سامنے تھا۔

ارشاد— کسی اچھے سے پرچے کا ایڈیٹر ہونا چاہتا تھا۔

آفتاب نے اپنی محبوبہ سے شادی کو ہی اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا۔

پردیب کو پولیس کی نوکری پسند تھی، اسے آئی۔ جی— بننے کی تمنا تھا۔

ماجد امریکن ایئر لائن کمپنی کے انتخاب میں بیٹھ رہا تھا، اسے بیرونِ ہند جانے کی آرزو تھی۔

رادھے نے اپنی خواہش کا اظہار صاف صاف الفاظ میں کرنے کے بجائے لکھ دیا تھا، ''ہز ہائینس رادھے شیام دی گریٹ۔'' اور خود اس کا یہ خیال تھا کہ بی۔ اے کرنے کے بعد آئی۔ اے۔ ایس کے امتحان میں بیٹھے گا۔ کچھ دنوں کی ڈپٹی کلکٹری کے بعد مجسٹریٹ ہو جانا تو یقینی تھا— اس نے کاپی میں سے یہ کاغذ نکال لیا، اور ایک موٹی سی کتاب میں کچھ اس طرح رکھ دیا کہ تھوڑا سا حصہ باہر نکلا رہے۔ پھر اس نے کھونٹی پھر سے میلا سا تولیہ اُتارا، ایک پرانی ٹائی نیچے گر گئی۔ اس نے ٹائی اپنی جگہ پر ٹانگ دی، تولیہ سے پسینہ پونچھا اور ردی ایک جگہ اکٹھی کی۔ دونوں ہاتھوں میں لے کر وزن کا اندازہ کیا۔ پھر تولیہ میں لپیٹ کر نیچے اُترنے لگا— آخری سیڑھی پر وہ ایک لمحہ کے لیے رُکا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر جلدی سے بائیں ہاتھ والی پارچون کی دوکان میں گھس گیا۔ جہاں سے اسے روپیہ سوا روپی مل گیا۔ اس نے دو کیپسٹن

سگریٹ خریدیں اور کمرہ میں واپس آ کر لیٹ گیا۔ پاس ہی چھوٹی سی میز پر کچھ کتابیں بکھری ہوئی تھیں، ایش ٹرے میں سگار، سگریٹ اور بیڑی کے ٹکڑے پڑے تھے۔ پھر لیٹے لیٹے اسے جانے کیا سوجھی اور اس نے کتاب کے بیچ سے وہی کاغذ نکال لیا۔ اور ان دوستوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ پردیب کے بارے میں اسے کچھ علم نہ تھا۔ ارشاد ایک مڈل اسکول میں ماسٹری کرتا تھا، آفتاب کی محبوبہ کسی اور سے بیاہ دی گئی تھی، اور خود وہ بے روزگار تھا۔ رادھے دو تین سال قبل ممبئی میں تھا، اس کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ وہ وہاں کسی فرم میں ملازم ہے اور اچھی خاصی زندگی گزار رہا ہے۔ ہز ہائنس نہ سہی پھر بھی اس سے ہزار گنا اچھا تھا۔ پھر اسے ارشاد نے بتایا تھا کہ رادھے کی نوکری چھوٹ گئی ہے، اور وہ بہت پریشان ہے لیکن ارشاد کا کیا، اس کی بات کا کیا بھروسہ۔ ان بے کاری کے دنوں میں اسے دو چار تلخ تجربے بھی ہوئے۔ ایک صاحب جن کے اس پر کچھ روپے باقی تھے، آدھمکے۔ اس نے بڑی مشکل سے ان سے پیچھا چھڑایا، اور وہ جاتے وقت دھمکی دے گئے کہ کل دو بجے تک پیسے ضرور وصول کرلوں گا۔ پریشان ہو کر وہ کمرہ سے باہر نکل آیا اور نظیر آباد آگیا، یہاں اس نے معمولی سی چپل خریدی۔ دوکان سے باہر نکلا ہی تھی، کہ کسی مانوس سی آواز نے اسے پکارا۔

"احمد ـ!"

ذرا کی ذرا میں کسی نے اسے گلے سے لگا لیا اور اس زور سے دبایا کہ اس کی ہڈیاں چیخ گئیں۔ اس نے بمشکل خود کو چھڑایا۔ سامنے رادھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس وقت اسے یہ بھی نہ سمجھ میں آیا کہ اس خوشی کا اظہار کیسے کیا جائے اور وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پایا۔

"رادھے ـ ارے تو کہاں، بمبئی سے کب آیا؟"

لے دے کے یہی الفاظ تھے جو بمشکل اس کے منہ سے نکل پائے، حالانکہ اس وقت وہ نہ جانے کیا کیا کہنا چاہتا تھا، اس کا دل خوشی سے باہر نکلا جا رہا تھا۔ رادھے بدستور سامنے کھڑا

مسکرا رہا تھا۔ خط و خال تیکھے اور دلفریب، بھولی بھالی معصوم آنکھیں جن میں آج بھی نہ جانے کتنی اُمیدوں اور آرزوؤں کی چمک باقی تھی اور گورا رنگ ۔ وہ ہلکے سلیٹی رنگ کا پتلون پہنے ہوئے تھا۔ پتلون کا یہ کپڑا جس میں اُون اور سوت کی آمیزش ہوتی ہے اور جسے امیر لوگ گرمیوں میں بھی استعمال کرتے ہیں، اس کی امارت کا راگ الاپ رہا تھا۔ اگر امارت نہ کہا جائے تو بھی یہ طے تھا کہ وہ خوش حال زندگی بسر کر رہا تھا۔ پتلون کی کریز میں ایک بھی شکن نہ تھی ۔ یہ سب کچھ اس نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا۔ پھر فوراً ہی اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی۔ قمیص پسینہ کی وجہ سے جسم سے چپک گئی تھی، بٹن ٹوٹ جانے کی وجہ سے اس نے آستینیں کہنیوں کے اوپر چڑھا لی تھیں ۔ پتلون کا حال یہ تھا کہ اگر قمیص اندر نہ ہو اور مہریاں نہ مڑی ہوں تو بہ آسانی پاجامے کا گمان ہو سکتا تھا۔

وہ رادھے کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"کہاں ہو، کیسے ہو، کیا کر رہے ہو؟" اس نے ایک ہی سانس میں اتنی بہت سی باتیں پوچھ ڈالیں۔

"اچھا ہوں۔" رادھے نے کہا اور پھر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"یہاں کیا پوچھ رہے ہو، چلو کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے شائے ہو جائے۔"

"یار چائے کی عادت بھی کہیں چھوٹتی ہے۔" یہ کہہ رادھے نے کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ہنسنے لگا۔ "نہ چائے چھوٹی اور نہ شائے کہنے کی عادت۔"

"کیا کر رہے ہو، کیسی گزر رہی ہے؟" احمد نے پھر وہی سوال دہرایا۔

رادھے نے اس کی طرف دیکھا اور بولا ۔ "راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ اپنی کہو۔"

"اپنی بھی اچھی ہی گزر رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ رادھے کو اس کی یہ خاموشی ایک آنکھ نہ بھائی اور اُس نے مزید دریافت کیا۔

"کس دفتر میں ہو؟"

"دفتر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" احمد نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "کلرکی سے مجھے نفرت ہے۔"

"لا ہاتھ — بس تو ہے میرا یار، میرے کو بھی کلرکی کی بات بالکل پسند نہیں۔" اور یہ کہہ کر اس نے احمد کا ہاتھ زور سے دبایا۔ اس ہاتھ ملانے میں اس کا ہاتھ چائے کی پیالی سے ٹکرا گیا لیکن رادھے نے دوسرے ہاتھ سے پیالی پکڑ لی، میز اور کرسی کے ہلنے جلنے سے تھوڑی بہت کھٹر پڑ ہوئی اور اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے لوگوں نے عجیب سی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"اصل بات یہ ہے کہ میں نے ایک جگہ کلرکی تو کی تھی،" اس نے کہا، "لیکن ہیڈ کلرک کی دھونس برداشت کرنا میرے بس کا روگ نہیں تھا، اور میں نے تیسرے ہی دن استعفیٰ دے دیا۔" یہ جملہ پورا کر کے اسے ایک گونہ سکون سا ہو گیا اور وہ اس سلسلہ کی اگلی کڑی کے بارے میں سوچنے لگا۔

قبل اس کے کہ رادھے مزید کچھ دریافت کرے اس نے خود ہی شروع کر دیا۔ "آج کل فری لانسنگ کر رہا ہوں، پچاس ساٹھ ریڈیو سے مل ہی جاتے ہیں۔ اتنے ہی رسالوں سے پیٹ لیتا ہوں۔ اور ترجمہ کا کام اوپر سے۔ ایک اپنی جان ہے، سو اس کے لیے اتنے پیسے بہت کافی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے فخر سے گردن اُٹھالی۔

پاس والی میز پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے سگریٹ جلائی اور رادھے کو جیسے کچھ یاد آ گیا اور اس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔

"سگریٹ،" اس نے کیپسٹن کی ڈبیا نکالتے ہوئے کہا، "یار یہ سگریٹ کی لت بھی کچھ عجیب ہے اور پھر جو سگریٹ منھ سے لگ جائے وہ تو چھٹتی ہی نہیں۔"

'ہوں — چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی۔" احمد نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے اس نے نہایت مناسب بات نہایت مناسب موقع پر کہی ہو۔

رادھے بولا۔ ”کیپسٹن آج کل بالکل بھوسہ آرہی ہے۔ جب سے ہندوستان میں بننے لگی ہے، بالکل کنڈم ہوگئی ہے۔ اپنے کو تو اسٹرانگ سگریٹ چاہیے۔ لیکن یار یہ زمانہ ایسا آگا ہے کہ دکھاوے کے بغیر کام ہی نہیں چلتا۔ ہائے وہ بات کہاں کیپسٹن والی۔“

کیپسٹن کی ڈبیا کے اندر چارمینار کی پانچ چھ سگریٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ دونوں نے ایک ایک سگریٹ جلائی۔

بوائے کو آتے ہوئے دیکھ کر رادھے بولا۔ ”یار دیکھ بل میں پے کروں گا۔“

”یہ غلط ہے۔“ احمد نے سوچا کہ ایک بار تکلف تو کرنا ہی چاہیے۔ ویسے رادھے زور تو دے گا ہی، اتنے دنوں کے بعد ملا ہے۔

”تیری عادت اب تک نہ گئی۔“ رادھے نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا، ”چل تیری ہی بات رہ جائے۔ لیکن آگے کبھی ایسی بات کی تو بس۔“

احمد کے لیے یہ ایک کڑوی گولی تھی، جسے بہ آسانی نگلنے کے لیے اس نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

”اور تم نے اپنی تو کہی ہی نہیں۔“

”میری کیا۔ کسی سالے کی نوکری تو آج تک ہو ہی نہ سکی۔ آج کل تو بامبے کی ایک فرم کا سول رپرزینٹیٹیو ہوں۔ ایسٹرن ڈسٹرکٹس پورے کے پورے اپنے قبضہ میں ہیں۔“ اس نے ڈبیا سے دوسری سگریٹ نکالی اور پہلی سے جلاتے ہوئے بولا۔ ”اگر تو بھی کچھ محنت کرنا چاہے تو اپنے ہیڈ آفس کو لکھوں۔“

احمد کی جو حالت تھی وہ ظاہر ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے فری لانسنگ کی خود ساختہ کہانی اور خواہ مخواہ کی مسکراہٹ کے باوجود رادھے اس کے دل کی بات جاننے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اسے ایک دھکا سا لگا اور آنکھیں ندامت سے جھک گئیں۔ لیکن ملازمت اور ایسی ملازمت جس میں پہلی کو کچھ بندھے ٹکے پیسوں کی امید ہو، بڑی چیز ہوتی ہے، اور

پھر رادھے اس کے سامنے موجود تھا۔ نفیس ٹراپیکل کا پتلون، ریشمی قمیص، کلائی میں گھڑی، اور سنہری چین۔ یہ ساری باتیں اس کے ذہن میں ایک ہی لمحہ گھوم گئیں اور اس نے کہا۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں — فری لانسنگ بھی چلے گی اور ملازمت بھی۔"

"روپیہ بڑی چیز ہے پیارے — اب میرے ہی کو دیکھو۔" اس کے لہجہ اور طرزِ گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اسی حد تک قریب آجانا چاہتا تھا جتنا وہ کالج کے دنوں میں تھا۔ اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ دنیا جو ہے نا، سالی بالکل چوپٹ ہے۔ کوئی کسی کا نہیں ہوتا، بھائی بھائی کا نہیں — بے کاری کے دنوں میں سب سالے رشتہ ناتہ دار ہاتھ جھاڑ کر الگ کھڑے ہو گئے۔ کسی نے پھوٹی کوڑی سے بھی مدد نہ کی۔ اور آج سب کی آنکھ کا تارا ہوں تارا۔" پھر رادھے کا لہجہ یکا یک بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ "بیٹا یہ عزت میری تھوڑی ہو رہی ہے، عزت کراتا ہے پیسہ۔"

"ہاں بھائی پیسہ بڑی چیز ہے۔" اس نے بڑھے ہوئے شیو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ یار میرا تو کچھ نہیں۔" رادھے بولا۔ "ابھی دو روز ہوئے بامبے سے آیا ہوں۔ میرے ایک دوست مسٹر بھٹاچاریہ ہوم منسٹر کے سکریٹری ہیں۔ آج کل انھیں کے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں، کل سہارن پور جا رہا ہوں۔ پھر پرسوں یعنی 26/اگست کو حضرت گنج میں ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے گھڑی کی سنہری چین کی طرف نظر ڈالی اور بولا۔ "اپن تو لاؤ بالی آدمی ہیں، بالکل لاؤ بالی، دل میں درد سب کا ہے، محبت سب کی ہے، اپنے بارے میں تو سوچتا ہی نہیں اور پھر تیرے لیے تو کیا کچھ نہیں کر سکتا، پر سالا دماغ ایسا ہو گیا ہے کہ کچھ یاد ہی نہیں رہتا، یاد دلاتے رہنا، ملتے رہا کرنا۔"

اب دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے اپنی قمیص کے کف کو جو گھڑی کے اوپر آگیا تھا، ذرا کھسکا لیا جس سے گھڑی صاف نظر آنے لگے۔ پھر اس نے احمد کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔

''دماغ خراب ہونے کی بات جو کی تھی سو آج بھی دماغ بالکل ایسا ہی ہے۔ اس پر یہ بھی کہ ایک بار اڑتی چڑیا دیکھ لوں تو پھر کبھی نہ بھولوں، لاکھوں میں پہچان لوں، پر یار یہ روپے سالے کا چکر ایسا ہے کہ آدمی سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے، ایک دن کے آرڈر کا تار نہ دوں تو کمپنی کو ہزار باروپے کا گھاٹا ہو جاتا ہے۔ اس میں اپنے بھی سو دو سو روپے اِدھر کے اُدھر ہو جاتے ہیں۔''

احمد سب کچھ سنتا رہا۔ سب کچھ دیکھتا رہا۔ جوتے کی چمک، گھڑی کی سنہری چین اور ٹراپیکل کے پتلون نے اس کے دماغ کے کونوں تک کو بھر دیا۔ اس کا جی چاہا راد ھے سے لپٹ جائے، اسے سب کچھ بتا دے، اس پر سب کچھ ظاہر کر دے، لیکن نہ جانے کیا سوچ کر رہ گیا اور اس نے صرف اتنا پوچھا۔

''ترسوں شام حضرت گنج؟''

''شیور۔''

حضرت گنج میں ٹہلتے ہوئے اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ اگر راد ھے کی نظرِ عنایت ہو گئی اور وہ نوکری والی بات بن گئی تو شاید دن پھر جائیں — کل گورکھپور سے اس کی ماں کا خط آیا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ میں نے منت مانی ہے کہ جب تجھے نوکری ملے گی تو بڑے پیر صاحب کی نیاز دلاؤں گی۔ دوسری طرف چھوٹے بھائی نے لکھا تھا کہ اگر آپ کہیں تو میں حساب اور انگریزی کے لیے دس روپے کا ایک ماسٹر رکھ لوں — وہ ماں کو دو مہینے سے ٹال رہا تھا کہ حالات بس سازگار ہونے ہی کو ہیں۔ آج صبح ہی صبح اس نے ایک جگہ سے پانچ روپے لیے تھے کہ زیادہ سے زیادہ تین چار دن میں واپس کر دے گا، کتابوں کے کمیشن کا روز روز حساب کرنے میں خواہ مخواہ کی پریشانی ہوتی تھی، اس لیے یہ طے پایا تھا کہ ہفتہ کے ہفتہ حساب ہوا کرے گا۔ ان پانچ روپوں میں سے اس نے ایک کیپسٹن کی ڈبیا اور ماچس خریدی تھی، پان کا ایک بیڑا منہ میں دبایا تھا، بس کا کرایہ دیا تھا اور اب کچھ آنے اوپر چار روپے اس

کی جیب میں پڑے ہوئے تھے۔

نیو انڈیا کافی ہاؤس سے نکلتے ہوئے اس نے سوچا کہ رادھے سے ملازمت والی بات چھیڑ دی جائے۔ اسی خیال کے تحت اس نے بل ادا کرنے میں بھی پہل سے کام لیا تھا اور رادھے نے بھی اجنبیت کی تمام دیواروں کو توڑ دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے یار تھے۔

"یار! اس کے بارے میں کچھ کیا — میرا مطلب ہے اس نوکری سے۔" اس نے بے تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

رادھے نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا۔ پھر راکھ جھاڑنے کے لیے چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ "آج سہارن پور کے سامان کا جو آرڈر بھیجا ہے اس میں تیرا ذکر کر دیا ہے — اگلے ہفتہ دہلی جانے کا پروگرام ہے۔ بس دہلی گیا اور کام بنا۔"

پھر ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"کچھ ایسٹرن ڈسٹرکٹس رہ گئے ہیں، میں سوچتا ہوں انھیں بھی کور کر ڈالوں، یار مارکیٹ سالے میں ایسا کمپٹیشن ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو — آج بارہ بجے والی گاڑی سے جاؤں گا۔ کل کا دن بیچ پرسوں اسی وقت ملاقات ہوگی۔"

ہفتہ کے آخر میں اسے کمیشن کے بیس بائیس روپے مل گئے۔ پینتیس روپے ایک صاحب پر کبھی کے اُدھار تھے۔ خدا نے ان کے دل میں نیکی ڈال دی اور انھوں نے واپس کر دیے۔ ان روپیوں سے کچھ کام تو چلا، سوکھے دھانوں پانی پڑا، کچھ پیسے اخبار والے کو دے دیے۔ تین مہینے کا کمرہ کا کرایہ ادا کرنا تھا، اس میں سے دو مہینے کا ادا کر دیا۔ پان والے کے کچھ پیسے باقی تھے اسے دے دیے، اور یہ سب ادا کرنے کے بعد اس کے پاس تقریباً تیس روپے بچ رہے تھے اور اس نے سوچا تھا کہ مہینہ کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گا۔ پھر اس نے پورے چاند کی ایک حسین رات میں لیٹ کر جب وہ کیپسٹن سگریٹ کے کش لگا رہا تھا، سوچا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ پیسہ اچھی چیز ہے، ضروری بھی ہے لیکن اس کے علاوہ کچھ آفاقی

قدریں بھی ہوتی ہیں، خاندان کی عزت بڑی چیز ہے۔ اس کے چچا دہلی یونیورسٹی میں سائنس کے پروفیسر تھے، اور اس کے دور کے ایک رشتہ دار آج بھی لکھنؤ میں سیلس ٹیکس کمشنر تھے اور پھر یہ کہاں کے شریف آدمیوں کا طور طریقہ تھا کہ سائکل کے دونوں طرف اور پیچھے کیریر پر بیس پچیس سیر کتابیں لادے چلے جا رہے ہیں۔ غرض حالات کی اونچ نیچ، خاندان کی عزت اور سچ تو یہ ہے کہ ملازمت کی اُمید پر اس نے کتابوں کا کام چھوڑ دیا۔

"باقی ضلعوں میں کتنے کا بزنس کیا۔" احمد نے رادھے سے پوچھا۔ اس نے سوچا، کہ اسی کے ساتھ ساتھ میں ملازمت والی بات بھی دریافت کر لے گا۔

"کیا خاک بزنس ہوئی، یار یو۔ پی۔ سالا بالکل چوپٹ ہے۔" رادھے نے پیشانی پر سے بال ہٹاتے ہوئے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ "اڑتالیس گھنٹے میں بیس ہزار — دو فیصدی کے حساب سے کل چار سو — یہاں سالی یو۔ پی۔ میں ایسا لگتا ہے ہزار ڈیڑھ ہزار سے ایک پیسہ اوپر نہ بڑھ پاء گا بامبے میں دس دس ہزار پیٹ لیتے ہیں۔" رادھے نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس کی ان باتوں نے احمد پر کیا اثر چھوڑا ہے، اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"پھر بھی اچھا خاصہ ہے۔"

"خاک اچھا خاصا ہے۔ بور ہے بور، آج کل ہزار ڈیڑھ ہزار میں ہوتا ہی کیا ہے۔" اس نے کف کے بٹن کھول دیے اور انہیں پلٹنے لگا۔

"وہ میری نوکری کا کیا ہوا؟" اس نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

"کل پرسوں دہلی جانے کا پروگرام ہے۔ تار سے روپے منگوائے ہیں، چیک سے دیر لگے گی۔ بس روپے آئے اور میں گیا۔"

احمد کو اس یقین دہانی کے بعد حضرت گنج زیادہ حسین نظر آنے لگا۔

ریستوران میں بوائے جب برتن لے جانے لگا تو رادھے نے اس سے کہا۔

''منیجر سے پوچھو چیک اکسیپٹ کرتے ہیں۔''

''نو سر۔''

''میرے پاس ٹوٹے پیسے ہیں۔'' احمد نے کہا۔

''اچھا خیر۔'' رادھے نے کہا اور ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد بظاہر جھنجھلا گیا۔ ''اس بار اور تیرا کہا ہو جائے، پھر کبھی بل پے کرنے کا خیال بھی ظاہر کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

اسے رادھے سے کافی اُمیدیں تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ اس نے کتابوں کا کام انھی امیدوں پر چھوڑ دیا تھا، پھر بھی اس وقت بل پے کرنے کا خیال اسے کچھ اچھا نہ معلوم ہوا۔ اس کے پاس لے دے کے یہی پچیس روپے رہ گئے تھے، لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔۔۔۔۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی، بائیں طرف ٹیبل پر ایک فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔ دو لڑکیاں، ایک بچہ،، ایک خوبصورت ادھیڑ عمر کا جوڑا، غالباً والدین ہوں گے۔

دوسری طرف کچھ طالب علم بیٹھے ہوئے تھے، ان کی باتوں اور اندازِ گفتگو سے اسے اپنے کالج کے دن یاد آ گئے۔ اس نے کیسی کیسی اُمیدیں باندھی تھیں، بیوہ ماں کے لیے کیا کچھ نہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ان کی صحت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ چھوٹے بھائی کی مناسب تعلیم نہیں ہو پا رہی تھی اور وہ ایک معمولی اسکول میں خراب ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ ان خیالات سے پریشان ہو گیا۔ اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی، لیکن اس نے اسے وہیں دبا دیا۔ رادھے جو اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا، بولا۔

''کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔ قطعاً کچھ نہیں۔''

حضرت گنج کا ایک راؤنڈ لگانے کے بعد رادھے نے کہا۔ ''کل پرسوں تک میرا روپیہ آ ہی جائے گا، اور میں دہلی چلا جاؤں گا۔ ایک ہفتے سے پہلے تو لوٹنے سے رہا۔۔۔۔۔ تو پھر

اگلے ہفتے ملاقات ہوگی۔"

"کہاں ...... ! تمہارے گھر آجاؤں۔" احمد نے پوچھا۔

"اب میرا گھر کہاں ڈھونڈتا پھرے گا۔" رادھے نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔

"میں خود آکر تجھے حضرت گنج میں ڈھونڈ لوں گا یا پھر تو اپنا گھر بتا دے۔ میں ہی کیوں نہ آجاؤں؟"

"آنا تو حضرت گنج ہی ہوگا۔ کیوں ناحق پریشان ہوا جائے۔ مکان تلاش کرنے میں بھی تھوڑی دقت ہوگی۔" احمد نے خوبصورتی سے ٹال دیا۔

"اچھا تو میں چلا۔"

"چیریو۔"

"چیریو۔"

"لیکن ہاں سنو۔" رادھے نے تھوڑی دور جانے کے بعد واپس آتے ہوئے کہا، "اگر تم پندرہ روپے دے دو تو میں ٹی۔ ایم۔ او۔ کا انتظار نہ کروں، وہاں جلدی جانے میں شاید تیرا کام کرنے میں بھی کچھ آسانی ہو ...... نہ ہوا تو وہاں جا کر منی آرڈر ہی کر دوں گا۔"

یہ ایک ایسا لالچ تھا جسے وہ بآسانی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ "کافی ہاؤس" میں بل پے کرتے وقت رادھے اس کے پاس روپے دیکھ بھی چکا تھا ورنہ شاید بہانہ بھی ہی کر دیتا۔ اس نے جیب سے روپے نکال کر کچھ کہے بغیر رادھے کے حوالے کر دیے۔

اگلا ہفتہ آیا اور گزر گیا، اگلا مہینہ بھی آیا اور گزر گیا، نہ رادھے لوٹ کے آیا اور نہ روپے ہی آئے۔ اس نے ہوم منسٹر کے سکریٹری مسٹر بھٹاچاریہ سے ملاقات کر کے رادھے کے بارے میں بھی معلوم کرنا چاہا اور دو بار ان کے یہاں گیا بھی لیکن اتفاق سے ان سے ملاقات نہ ہو سکی ...... اس دوران میں اسے ایک شخص پر رادھے کا گمان بھی ہوا، اس نے آواز بھی دی لیکن اس نے پلٹ کے نہ دیکھا۔ اس نے سوچا کوئی اور ہوگا۔ کیا اس سے ملتا جلتا کوئی اور

نہیں ہو سکتا۔

ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا رجسٹریشن کارڈ لے کر اس نے دن دن بھر دفتروں اور فرموں کے چکّر کاٹنا پھر شروع کر دیے لیکن نوکری ملنا کوئی آسان مسئلہ تو تھا نہیں۔۔۔۔۔ اس نے مجبور ہو کر ٹیوشنوں کے لیے ادھر اُدھر ہاتھ مارے اور کچھ جان پہچان کے لوگوں کے توسط سے دو تین اچھے ٹیوشن مل بھی گئے، لیکن اس نے ملازمت کا خیال ترک نہ کیا۔ جہاں کہیں جگہ نکلتی درخواست دے ہی دیتا۔ ہر مہینہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا ایک آدھ چکّر بھی کاٹ لیتا، کوئی یار دوست ملتا تو نوکری کی بات اس کے کان میں بھی ڈال دیتا۔۔۔۔۔ رادھے والی بات اس کے ذہن سے بالکل محو ہو چکی تھی۔

ایک ٹیوشن اور مل گیا، جیب میں کچھ روپے آئے۔ ملازمت کی تلاش میں بھی کمی ہو گئی۔ روز شام نہ سہی، دوسرے تیسرے دن حضرت گنج بھی جانے لگا۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کی چکّر بھی کم ہو گئے۔ اس طرح کچھ دن گزر گئے، پھر ایک طالب علم کے والد کا تبادلہ ہو جانے سے ایک ٹیوشن چھوٹ گیا اور پیسہ کی تھوڑی بہت تنگی پھر ہو گئی تو اس نے سوچا کہ خالی خولی ٹیوشن کے سہارے تو زندگی نہیں کاٹی جا سکتی۔ ملازمت معمولی ہی سہی، بہرحال ان سے اچھی ہے، ان کا کیا آج ہیں کل نہیں۔ لڑکوں کے ساتھ مہینہ بھر مغز ماری کرو، تب مہینہ کے آخر میں کہیں پندرہ بیس روپے ہاتھ لگیں اور یہ خیال آتے ہی اس نے ارادہ کر لیا کہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج جا کر دوبارہ کارڈ بنوائے گا اور کچھ اثر رسوخ تلاش کرے گا۔

اس نے اپنا کارڈ دوبارہ بنوایا۔ جان پہچان کے دو ایک کلرک تھے، انھیں جا کر سلام کیا۔۔۔۔۔ پھر نوٹس بورڈ پر لگی ہوئی ایک فہرست پڑھنے لگا۔ یہ فہرست ان لوگوں کی تھی جنھوں نے گزشتہ ایک ہفتہ میں اس دفتر سے کارڈ بنوائے تھے۔ نظر دوڑاتے دوڑاتے وہ ٹھٹھک سا گیا۔ سینکڑوں ناموں کے بیچ ایک نام پر نہ جانے کیسے اس کی نظر پڑ گئی۔

”رادھے شیام سکسینہ۔ بی۔ اے۔“

''لیکن یہ اپنا رادھے نہیں ہو سکتا۔'' اس نے زیرِ لب کہا۔ ''وہ شاید بامبے ہی میں رہ گیا۔ اسے یو۔ پی۔ پسند نہیں آیا تھا۔ یہاں اس کا بزنس بھی بالکل ٹھنڈا تھا۔'' پھر فوراً ہی اسے پندرہ روپے یاد آگئے۔ لیکن اس نے سوچا کہ رادھے لاابالی تو ہمیشہ کا تھا۔ اب تو پیسے ہاتھ میں آگئے ہیں، کاہے کو روپے بھیجنے کا خیال آیا ہوگا، اور پھر اُسے کی حالت کا صحیح علم بھی تو نہیں تھا۔ شاید اسے پتہ بھی معلوم نہ ہو۔

پھر ایک دن اسے کسی کام سے صدر ریلوے کراسنگ راہی آگے بڑھا تھا کہ اسے ایک شخص پر رادھے کا گمان جو دونوں ہاتھوں سے پانی بھری بالٹیاں تھامے ہوئے تھا۔ اس کی چال ڈھال بالکل رادھے سے ملتی تھی۔ چوڑے شانے اور مضبوط جسم۔۔۔۔۔ اس نے آواز دی، بالٹی والے شخص کی رفتار تیز ہوگئی، لیکن اس نے مڑ کے نہ دیکھا اور ایک چھوٹے سے مکان میں گھس گیا۔ وہ سائکل سے اُتر پڑا اور اسی مکان کی طرف بڑھنے لگا جس میں رادھے گھس گیا تھا۔ اس نے رادھے کو آواز دی، اندر سے کوئی جواب نہ آیا، موت کا سناٹا طاری تھا، پھر ہلکی ہلکی کھسر پھسر سنائی دی اور ذرا ہی دیر میں بالمکند باہر نکل آیا۔

بال رادھے کا چھوٹا بھائی تھا، بولا۔

''ارے آپ یہاں۔۔۔۔۔ بھیا تو ہیں نہیں۔ بمبئی گئے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ خود ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ روز منی آرڈر والے ڈاکیہ کی راہ دیکھتے ہیں۔ نہ جانے کیا کرنے لگے۔''

''کوئی بات نہیں میں تو یوں ہی آگیا تھا۔'' اس نے کہا۔

سامنے کوارٹر کے پاس دیوار پر پنسل سے لکھا ہوا تھا۔

''ہز ہائی نس رادھے شیام دی گریٹ۔''

■ ■

Sab se Chhota Gham (Short Stories)

Abid Suhail

arshia publications
arshiapublicationspvt@gmail.com
ISBN 978-93-81029-28-2
9 789381 029282
A for Arshia Publications

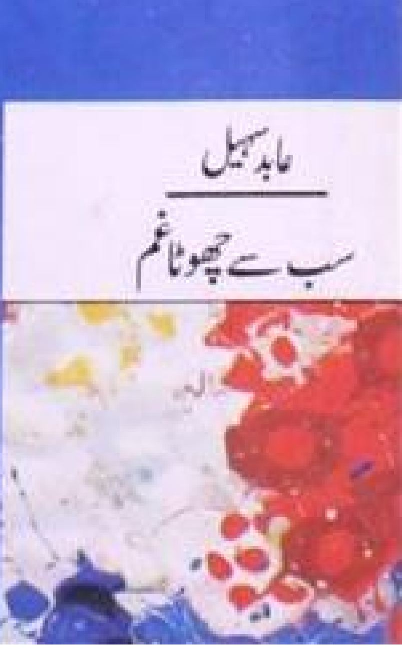

عابد سہیل

سب سے چھوٹا غم